

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تعمیر حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۲۰
۱۰ جنوری ۲۰۲۳ء مطابق ۱۶ جمادی الثانی ۱۴۴۴ھ
شمارہ نمبر

اس شمارے میں

۴	قاری سید صدیق احمد ہندوئی	شعروادب نبی کی راہ سے ہم کٹ گئے ہیں.....
۵	شمس الحق ہندوئی	اداریہ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو بہا ہی
۷	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ہندوئی	چراغ راہ اسلام کی حیات و بقا اور دینی مدارس
۱۰	مولانا عبدالماجد دریا بادی	اصلاح حال خواجہ معین الدین چشتی اور مسلمان
۱۱	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ہندوئی	صحبتے با اہل دل بچوں کی عمر کے مراحل اور ان کی نفسیات
۱۳	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ہندوئی	فکر و نظر اسلامی تہذیب میں انسانی حقوق.....
۱۷	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	راہ عمل ملت کی سرفرازی اور سرفروئی.....
۲۰	مولانا جعفر مسعود حسنی ہندوئی	محاسن اسلام کامیاب زندگی کی ضمانت
۲۱	مولانا بلال عبدالحی حسنی ہندوئی	سعادت دارین رگوں میں وہ لہو بانی نہیں ہے
۲۲	مولانا سراج الدین ہندوئی	ارشاد و تذکیر رسول پر ایمان اور تقاضے
۲۳	انیس احمد ہندوئی	میر کاروان وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان
۲۷	عبید الرحمن ہندوئی	مغرب اور اسلام اسلامی نوآبادی اور مغربی دنیا
۲۹	محمد اصطفیٰ الحسن ہندوئی	رسید کتب تعارف و تبصرہ
۳۱	شاہد عمادی	علوم و فنون عہد اسلامی میں علم ریاضی.....
۳۳	مفتی محمد مظفر عالم ہندوئی	فقہ و فتاویٰ سوال و جواب

سرپرست

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ہندوئی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول
شمس الحق ہندوئی

نائب مدیر
محمد عمیر الصدیق دریا بادی ہندوئی

مدیر مسئول
محمد اصطفیٰ الحسن کاندھلوی ہندوئی

معاون مدیر
محمد حبیب اختر ہندوئی

مجلس مشاورت
مولانا عبدالعزیز بھنگلی ہندوئی

مولانا محمد خالد سیف اللہ رحمانی پوری ہندوئی

قارئین محترم! تعظیم حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN000125 -- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ایمیل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔
ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
TAMEER-E-HAYAT
Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com
مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون 400/- فی شمارہ 20/- ایٹائی، پوری، افریقی و امریکی ممالک کے لئے 75\$
ڈرافٹ نمبر تعیمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعیمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف
All CBS Payable Multiplicity Cheques روانہ فرمائیں، ضرورت دیگر = 30 جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔
آپ کی خریداری نمبر کے نیچے لکھ کر بھیجیں کہ آپ کا زرتعاون تم ہو چکا ہے، لہذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔
اوری آڈیٹ کو پن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، ہوبالک یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کو ڈیجیٹ لکھیں۔ (نمبر تعیمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد مظہر اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعیمیر حیات مجلس صحافت و نشریات نیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

نبیؐ کی راہ سے ہم کٹ گئے ہیں بے وفا ہو کر

مولانا قاری صدیق احمد باندویؒ

اُٹ آئے ہیں سب اہل جفا اب باوفا ہو کر
 غلام آئے ہیں آقا تیرے در پر بے نوا ہو کر

وفا کا وعدہ تو ہم سے برابر کرتے رہتے ہیں
 نہیں ملتے ہیں لیکن وہ کبھی بھی باوفا ہو کر

بتاؤں میں تمہیں ظالم کو یہ جرأت ہوئی کیسے
 نبیؐ کی راہ سے ہم کٹ گئے ہیں بے وفا ہو کر

دکھا سکتے ہیں نقشہ غزوہٴ احزاب و خیبر کا
 گزاریں زندگی جو ہم غلامِ مصطفیٰ ہو کر

خدا نے جب گدائی اپنے در کی ہم کو بخشی ہے
 کسی کے سامنے کیوں ہاتھ پھیلائیں گدا ہو کر

تمہیں کیوں فکرِ روزی ہو، تمہیں کیوں فکرِ راحت ہو
 رہیں گے ہم یہاں پر اب محکومِ قضا ہو کر

خداوند مرا بھی حشر ان کے ساتھ ہو جائے
 یہاں سے جو گئے ہیں پیکرِ صدق و صفا ہو کر

عنایت کی نظر کر دے الہی اپنے ثاقب پر
 وہ آیا تیرے در پر ہے، ترے در کا گدا ہو کر

☆☆☆☆☆

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

شمس الحق ندوی

جب ہارون رشید خلیفہ ہوا تو لوگ مبارک باد پیش کرنے کے لیے آئے، علماء بھی ادباء بھی اور شعراء بھی آئے اور اپنے علم و منصب کے اعتبار سے ہدایا اور تحائف سے لدے پھندے واپس ہوئے، مگر ابوسفیان ثوریؒ جو بچپن کے جگری دوست تھے، جنہیں سب سے پہلے آنا چاہیے تھا وہ نہ آئے؛ بلکہ انھوں نے قطعی بے رخی برتی جیسے اب بچپن کی حسین یادوں کا سارا دفتر محو ہو چکا ہو، یہی نہیں بلکہ طبیعت میں اتنا ہی تکدر، غصہ اور نفرت پیدا ہو گئی جتنا پہلے تعلق اور لگاؤ تھا۔

ایسا کیوں ہوا؟ جب کہ ایک کے تحت سلطنت اور دوسرے کے بوریا تک پہنچنے سے قبل کوئی ناگوار بات نہ پیش آئی تھی، باہم کسی قسم کا بغض و حسد تھا، نہ کینہ کپٹ اور نہ ایک کو تخت شاہی مل جانے کا دوسرے کو رنج یا حرص و طمع، یہ عجیب پہیلی ہے جس کو ہماری آج کی مادہ پرست دنیا اپنی ساری توانائیوں کے باوجود نہیں بوجھ سکتی، اگر بوجھ سکے تو شاید اس کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

اگر یہ نہ آنے والا آجاتا تو نہ جانے کیا کیا اعزاز اور آؤ بھگت ہوتی، کیسے کیسے انعامات حاصل ہوتے، بچپن کی بے داغ و پر خلوص محبت کے حق کن کن صورتوں سے ادا کیے جاتے، حضرت سفیان کو آنا تھا نہ آئے، ہارون کچھ دنوں تک تو اپنے نظم اقتدار میں ان کے آنے کا منتظر رہا، جب مایوس ہو گیا تو حضرت سفیان کو خط اور آنے کی دعوت دی۔

خط میں لکھا کہ: ”میرے بھائی! تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو باہم بھائی چارہ کا حکم دیا ہے، تم سے میری محبت اللہ کے لیے ہے، اس میں اب بھی کوئی کمی نہیں ہوئی ہے، ہمیں تم سے از حد محبت ہے اور رہے گی، اگر خلافت کی ذمہ داری سفر سے مانع نہ ہوتی تو میں ضرور تمہارے پاس آتا، خواہ ہزار دشواری تم تک رسائی میں پیش آتی، ہمارے تمہارے احباب میں کوئی ایسا نہیں جس نے آکر مجھے مبارکباد نہ دی ہو اور اس کو میں نے بیت المال سے خوب خوب ہدایا و تحائف نہ دیے ہوں، تمہیں مومن سے ملنے جلنے اور اس سے تعلق قائم کرنے کی فضیلت معلوم ہے، لہذا تم آنے میں جلدی کرو۔“

خلیفہ نے خط لکھ کر عباد طالقانی کے حوالہ کیا اور وہ کوفہ کے لیے روانہ ہو گیا، جب اس مسجد میں پہنچا جہاں حضرت سفیان ثوریؒ اپنے چند معتقدین کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے تو حضرت سفیان کو کھٹک پیدا ہوئی، انھوں نے جیسے محسوس کر لیا کہ عباد خلیفہ کا کوئی پیغام لا رہا ہے، بے ساختہ زبان سے نکلا:

”شیطان مردود سے اس خدا کی پناہ جو جاننے اور سننے والا ہے، ایسے آنے والے سے کہ جس کا آنا مشکوک ہے کہ بھلے مقصد سے آ رہا ہے یا کوئی پیغام آفت لا رہا ہے، یہ کہہ کر فوراً نماز کے لیے تیار ہو گئے، نیت باندھ لی، عباد مہبوت و حیرت زدہ کھڑا رہا، خدام میں سے کسی نے کہا کہ بیٹھ جاؤ، جیسے ان حضرات کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی، حالانکہ یہ حکومت وقت کا ایلیٹی تھا جس کا ایک اشارہ سب کے لیے قابل گردن زدنی ہو سکتا تھا کیونکہ یہ اس کی نہیں بلکہ خلیفہ کی توہین تھی، اس منظر سے عباد پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ بیٹھنا تو کجا پوچھنے کی بھی جرأت نہ ہوئی، کھڑے ہی کھڑے اپنے تھر تھراتے ہوئے ہاتھوں سے خلیفہ کا خط حضرت سفیان ثوریؒ کی طرف پھینک دیا، وہ اس خط

سے اس طرح چونکے اور اپنی جگہ سے ہٹے جیسے کوئی سانپ ان کے قدموں کے پاس آ گیا ہو، جب سلام پھیرا تو آستین سے اس احتیاط سے خط پکڑا جیسے کوئی خوفناک زہریلا جانور ہو، اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک خادم کو خط تھاتے ہوئے فرمایا کہ:

”پڑھو! میں اس بات سے پناہ چاہتا ہوں کہ ایسی چیز کو ہاتھ لگاؤں جس کو ظالم کے ہاتھوں نے چھوا ہو۔“

خط پڑھا گیا، حضرت سفیانؓ نے انتہائی استعجاب کی کیفیت میں مسکراتے ہوئے فرمایا: ”اس ظالم کا جواب اس خط کی پشت پر لکھ دو۔“
توجہ دلائی گئی کہ یہ خلیفہ وقت کے پاس جائے گا، مناسب تھا کہ کسی صاف ستھرے کاغذ پر لکھا جاتا، فرمایا کہ اس کی پشت پر ہی لکھو، اگر اس نے حلال ذریعہ سے اس کاغذ کو حاصل کیا ہے تو اسے اجر و ثواب ملے گا اور اگر حرام و ناجائز طور سے حاصل کیا ہے تو وہ خود اس کو لے کر جہنم میں جائے گا، میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز رہے جس کو ظالم کے ہاتھوں نے چھوا ہو اور اس سے ہمارے دین میں خلل آئے، مزید کسی کو کچھ کہنے کی مجال نہ تھی، کاتب نے پوچھا کہ کیا لکھیں؟ فرمایا لکھو:

”بندۂ ناچیز سفیان کی طرف سے امیدوں کے فریب خوردہ اس ہارون کے نام جس سے حلاوت ایمانی اور قرآن کی لذت چھن چکی ہے، میں نے تم سے رشتہ کاٹ لیا، محبت ختم کر دی، تم نے یہ خط بھیج کر مجھے اپنے خلاف گواہ بنا لیا ہے، تم نے مسلمانوں کا مال ان کی مرضی کے بغیر بے محل کیا ہے، کیا تمہارے اس عمل سے وہ لوگ جو تالیف قلب کے مستحق تھے نیز مجاہدین، اہل علم، یتیم اور بیوائیں اور عمال حکومت مطمئن اور خوش ہوں گے؟ تم اس سوال کا جواب تیار کر رکھو، عذاب خداوندی سے بچنے کا کوئی چارہ ڈھونڈ لو، جلد ہی تم قادر مطلق اور عادل حاکم کے سامنے کھڑے ہو گے، رعیت کے بارے میں خدا سے ڈرو اور امت کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال رکھو، اس صورت میں تم کیا منہ دکھاؤ گے جبکہ تم زہد و تقویٰ، تلاوت قرآن، نیکو کاروں کی ہم نشینی کی حلاوت سے محروم ہو چکے ہو اور اپنے کو ظالم اور ظالموں کا قائد بنا لیا ہے، اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا، تم پر کیا بیتے گی جب قادر کا منادی آواز دے گا کہ ظالموں کو اور ان کے معاونین کو جمع کرو، ذرا اس تکلیف کا تصور کرو جب تم خدا کے سامنے اس طرح آؤ گے کہ تمہارے ہاتھ تمہاری گردنوں سے بندھے ہوں گے اور ان کو تمہارے عدل و انصاف اور غربا پروری کے سوا کوئی طاقت نہ کھول سکے گی، تمہارے آگے پیچھے ظالموں کا گروہ ہوگا اور تم ان کے امام ہو گے، انھیں لے کر آگ کی طرف چلو گے، اپنی نیکیوں کو دوسروں کی ترازو میں رکھو گے اور دوسروں کی برائیوں کو اپنی ترازو میں پاؤ گے، ہارون! خلافت تمہارے پاس سے غیر کے پاس جانے والی ہے، اس دنیا کی یہی ریت ہے، یہاں کوئی خوش نصیب ہوتا ہے تو اس سے اپنی آخرت سنوار لیتا ہے، کوئی ہو اور ہوس کا بندہ ہوتا ہے تو اس سے اپنی دنیا و آخرت دونوں برباد کر لیتا ہے، تم اپنے بارے میں سوچ لو کہ نفع اٹھانے والوں میں ہو یا نقصان، خبردار! اس کے بعد مجھے کوئی خط نہ لکھنا، میں جواب نہ دوں گا۔“

خط کا مضمون ختم ہوا اور ایسے ہی کھلا ہوا عباد کی طرف پھینک دیا، عباد پر اس شان بے نیازی کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے دربار شاہی کی پوشاک اتار دی، اون کا جبہ اور عبا پہن لیا اور ننگے پاؤں ہارون کے پاس حاضر ہوا، ہارون عباد کو دیکھ کر مضطرب و پریشان ہو گیا، سر پٹنے لگا، اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا اور کہنے لگا کہ غلام کامیاب ہوا اور آقا محروم رہا، ہمارا دنیا سے کیا تعلق؟ ملک جلد مجھ سے چھن جائے گا۔

عباد نے ہارون کو سفیان کا خط بڑھا دیا، اب ہارون کی عجیب کیفیت تھی، خط پڑھتا جا رہا تھا اور زرار زرار رہ رہا تھا، بعض درباریوں نے کہا: امیر المومنین! سفیان نے بڑی جسارت کی ہے، اس کو گرفتار کرالیں تاکہ دوسروں کو عبرت ہو، ہارون کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور کہا:

”دنیا کے غلامو! سفیان کو انہی کے حال پر رہنے دو، فریب خوردہ تو وہ ہے جس کو تم دھوکہ دو، بدنصیب وہ ہے جس کے ساتھ تم دنیا دار لوگ بیٹھو، سفیان تو خود ایک دنیا ہے۔“

☆☆☆

چراغِ راہ

اسلام کی حیات و بقا اور دینی مدارس

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ہمیشہ بلا کسی دقت و دشواری کے بیت اللہ جاسکتے تھے، رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے روضہ پر حاضری دے سکتے تھے۔

ہندوستان میں فیض و افادہ کے بادل

جب بھی دنیا میں کوئی بڑا فتنہ آیا، یورش ہوئی جیسے کہ تاتاریوں نے دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا، تو اس وقت بڑے بڑے باصلاحیت، ذہین خاندان جن میں اسلامی عزت اور قوت عملی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، ہندوستان میں آ کر مختلف وقتوں میں پناہ لیتے رہے، تاتاریوں کے حملے کے وقت سر چھپانے کی جگہ نہ تھی، اس وقت دنیا کا جو ہر ہندوستان آ گیا، مصر و شام کو چھوڑیے، عراق، ایران، افغانستان کا کوئی بڑا عالم و عارف ایسا نہ تھا جو ہجرت کر کے ہندوستان نہ آ گیا ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں علماء، زاہدین و صوفیاء کا ایک بڑا خزانہ جمع ہو گیا، سمرقند و بخارا کا جو ہر ہندوستان آ گیا، یہاں کے سلاطین نے۔ جو علم کے جو یا، علماء کے قدر دان، معرفت و حکمت کے متوالے تھے۔ ان علماء کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اربابِ حق و صفا کا کردار
ہندوستان کی سرزمین پر اہل قلوب کی خاص توجہ رہی، کچھ تو باہر سے آئے اور کچھ کو اس سرزمین نے پیدا کیا، ان اہل اللہ نے اسلام کی بقا اور اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بھرپور کوشش کی، وہ سپر بن گئے اور ہر قسم کے خطرات کا دلیری اور اولوالعزمی سے مقابلہ کیا، انھوں نے بادشاہوں اور سلاطین کے سبز باغ کو فراموش کر کے اسلام کے چراغ کو بجھنے نہ دیا، اور یہ اللہ

اسلام سے گہرا تعلق درشتہ کیوں ہے؟ اسی وجہ سے کہا گیا ہے قرآن مکہ میں نازل ہوا، مغرب اقصیٰ میں حفظ کیا گیا، ترکی میں لکھا گیا، مصر میں پڑھا گیا، اور ہندوستان میں سمجھا گیا۔

اسلام سے تعلق کے اسباب
اگر ہم ہندوستان کی تاریخ پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ کچھ خصوصیات ہیں جو اسلام سے ان کے اس تعلق کا سبب ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی اسلام سے تعلق کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جب وہ ہندوستان میں آئے تو ان کی مثال ایسی تھی جیسا کہ ۳۲ ردائوں کے درمیان زبان یا بحر ظلمات میں منارہ کی، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، جب کسی کے مقابل ایسی طاقتیں ہوں جن سے ڈر ہو کہ وہ اس کو فنا کر دیں گی، اس کا وجود مٹا دیں گی تو پھر اس میں مقابلہ کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں نے بھی ہندوستان میں جب اپنے آپ کو ان طاقتوں کے مقابل پایا تو انھیں خطرہ پیدا ہوا کہ ان کے پاس جو اسلام کے سرمایہ کی بیش بہا دولت ہے، اگر اس کی حفاظت نہ کی گئی تو یہاں کی طاقتیں اسے نیست و نابود کر دیں گی، اس خیال نے انھیں اسلام کی حفاظت کرنے پر مجبور کر دیا، انھوں نے اسلام کو سینہ سے لگایا، اور جب انھوں نے اس طرح اسلام کو گلے سے لگایا تو خدا کا فضل و انعام ان پر ہوا، اور اس کی مہربانی ان پر سایہ فگن رہی، وہ

اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و احسان ہے کہ اس نے ہندوستان کو دینی علوم اور دین کی جدوجہد اور کوشش کے لیے انتخاب فرمایا، یہاں بڑے بڑے دین کے داعی، اہل اللہ، اہل قلوب، مبلغین پیدا ہوئے، انھوں نے قرآن و حدیث کا گہرا علم حاصل کیا، اس کی تعلیمات کو سینہ سے لگائے رکھا، اور ان کے مقابل جاہلیت، وحدۃ الوجود، مادہ پرستی اور ہندوستانی فلسفوں و تہذیبوں کی جو طاقتیں بھی آئیں، ان کا انھوں نے انتہائی ثابت قدمی و استقلال سے مقابلہ کیا جس کی مثال دنیا کے وسیع خطہ میں نہیں ملتی۔

اسلام سے ہندوستانی مسلمانوں کا رشتہ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام، اسلامی تعلیمات، رسول پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات گرامی سے، آپ کے لائے ہوئے طریقہ اور مسلک، وطن، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ارشاد فرمائی ہوئی حدیثوں سے، آپ کے طریقہ اور مسلک زندگی سے، جتنا تعلق ہندوستانی مسلمانوں کو ہے اتنا عرب ممالک کو بھی نہیں، اب بھی عربوں کو ہندوستانی مسلمانوں کی رقیق القسی، دینی ذوق اور اسلام کے ساتھ وفاداری کا احساس ہے، میں نے خود عربوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہندوستانی لوگ نہ عربی زبان جانیں نہ عربی سے آشنا ہیں، لیکن اس کے باوجود انھیں

کے بندے کسی طرح ٹس سے مس نہ ہوئے، انھوں نے اپنی جگہ جنبش نہ کی، بلکہ اپنی روش پر انتہائی ثبات و استقامت کے ساتھ جمے رہے، اور درس و تدریس اور فیض پہنچانے کا کام کرتے رہے، دین کی امانت کو سینہ سے لگائے رہے، اور ایک ایسی جماعت تیار کرتے رہے جو اس امانت کی حفاظت کرتی رہے، اور روحانی تنظیم و تربیت کے ساتھ ساتھ انھوں نے جب بھی ضرورت پڑی حکومت کو نیا خون دیا، اسے ہمیشہ توانائی عطا کی، معاشرہ جب جب بھی گرنے لگا انھوں نے اسے سنبھالا۔

مردم سازی کے کارخانے

انھوں نے قاضی، وزیر، محتسب تیار کیے، جو حکومت کی اہم ذمہ داریاں سنبھالتے تھے، اس طرح مردم سازی اور آدم گری کا کام بھی کرتے رہے، آدمیوں کے سکے ڈھالتے رہے، کھرا و خالص سونا تیار کرتے رہے، ان کے یہاں ہر قسم کا آدمی ڈھلتا تھا، تازہ دم اور بہادر سپاہی پیدا ہوتے تھے، محمد تعلق کے انتقال کے بعد جب حالات انتہائی دگرگوں تھے، تاناریوں کی یورش کا خطرہ تھا، دولاکھ ٹڈی دل لشکر مقابلہ میں تھا، فیروز تعلق حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیار نہ تھا، اگر اس وقت فیروز تعلق سربر مملکت پر نہ بیٹھتا تو انتہائی خطرات کا اندیشہ تھا، ہو سکتا تھا کہ آج ہندوستان کی تاریخ کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا، اس وقت نظام الدین اولیاء نے فیروز تعلق سے کہا: تم تخت سلطنت پر بیٹھتے ہو یا میں اللہ تعالیٰ سے کسی دوسرے کو مانگوں؟ اگر تم سربر مملکت پر بیٹھتے ہو تو میں تمہارے لیے خدا سے صلاح و فلاح مانگوں گا۔ تاریخ فیروز شاہی میں ہے کہ فیروز تعلق

تیار ہو گیا، اور بیس سال اس نے انتہائی شان و شوکت سے حکومت کی، اس کا زمانہ سنہری زمانہ کہا جاتا ہے، پوری مملکت میں نہ کہیں انتشار و پراگندگی تھی، اور نہ لوٹ کھسوٹ، نہ فسق و فجور تھا، نہ فحاشی و بدکاری تھی، وہ علم اور علماء کا حد درجہ قدر دانت تھا، اسے اپنے یہاں علماء کی موجودگی پر فخر ہوتا تھا، جس طرح بادشاہوں کو فتوحات، عمارتوں کا شوق ہوتا تھا، اسی طرح وہ آپس میں ایک دوسرے پر فخر کیا کرتے کہ ہمارے یہاں اتنا بڑا عالم ہے، اگر کوئی عالم باہر سے آتا تو اس کی عزت کرتے، بڑے سے بڑا اسے منصب عطا کرتے، اور ہر طرح اس کی دل جوئی کی کوشش کرتے تھے۔

مدارس کا فیض

اس زمانے میں نصاب تعلیم ایک ہی تھا، جس سے دینی امور اور سلطنت کے عہدوں کے لیے لوگ تیار ہوتے تھے، بڑے بڑے مدرسے قائم کرنے کا شوق تھا، ان مدارس کے لیے جاگیریں وقف ہوتیں، اور انہی مدارس سے ایسے جید علماء پیدا ہوتے جن کا صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں لوہا مانا جاتا تھا، یہ سلسلہ ہندوستان میں جاری رہا، ان مدارس سے جو لوگ فراغت حاصل کرتے وہ یا تو درس و تدریس کا سلسلہ قائم کرتے یا پھر بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز ہوتے۔

ہندوستان کے علماء کی لکھی ہوئی کتابیں دوسرے ملکوں میں پھیلتی رہیں، اور مختلف موضوعات اور علوم پر ضرورت کے مطابق کتابیں تصنیف کی جاتی رہیں، ہندوستانی علماء ان تمام علوم کو قبول کرتے رہے اور اپنے نصاب

میں انھیں جگہ دیتے رہے جو کہ دوسرے ممالک میں پھیلے یا جن کی ضرورت ہوئی، جن علوم کا بھی سکھ ہوا اسے انھوں نے قبول کیا، اس طرح یہاں کا نصاب ارتقاء سے گزرتا رہا، حالات اور ضروریات کے تحت اس میں تبدیلی ہوتی رہی اور یہ نظام چلتا رہا، لیکن جب اسلامی سلطنت میں ضعف آیا اور یہ ضعف روز افزوں بڑھتا ہی گیا اور بڑے بڑے لوگوں نے سمجھ لیا کہ اب یہ ضعف ختم نہیں ہو سکتا، ابن خلدون نے لکھا ہے کہ جب کوئی سلطنت بوڑھی ہو جاتی ہے تو پھر اسے جوان نہیں بنایا جاسکتا، مگر جب یہ نظر آنے لگا کہ ہندوستان کی سلطنت بوڑھی ہو گئی ہے، اس میں جینیس (عقبی) افراد پیدا نہیں ہو رہے ہیں، تو اس وقت کے علماء میں سے کچھ ایسے ہوئے جنھوں نے سیاست پر گہرا اثر ڈالا، انھوں نے اسلام کے سیاسی و اقتصادی حالات بیان کیے، ان لوگوں میں سرفہرست شاہ ولی اللہ دہلوی کا نام ہے، جنھوں نے ملکی سیاست پر گہرا اثر ڈالا، معرکہ الآراء کتابیں تصنیف کیں، اور اقتصادیات کے باریک مسائل کو نہایت مہارت کے ساتھ پیش کیا، انھوں نے بتلایا کہ بادشاہ کو کیا ہونا چاہیے، بادشاہ اور رعایا کے درمیان کس طرح کے تعلقات ہونا چاہئیں، اور بادشاہ کے کیا کیا اوصاف ہوں وغیرہ وغیرہ۔

اور جب شاہ ولی اللہ دہلوی نے دیکھا کہ مرہٹے ایک عظیم طاقت بن کر ابھرے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ہندوستان پر چھا گئے ہیں، تو انھیں اسلام اور سلطنت اسلام سخت خطرے میں معلوم ہوئی، انھوں نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی جس نے آ کر مرہٹوں کا زور توڑا، جب علماء نے

دیکھا کہ سلطنت کا ضعف دور ہی نہیں ہوتا تو انھوں نے چاہا کہ صاحب استقامت، جری، شجاع اور اولوالعزم لوگوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو اسلام کی حفاظت کا کام انجام دے، اور اگر مسلمان سلطنت سے محروم بھی ہو جائیں تب بھی اسلام یہاں سے نہیں مٹے، اور یہ لوگ اسلام کی حفاظت اور مستقبل کو سنہرا اور بہتر بنانے کی کوشش کریں، پھر وہ علماء کی ایسی جماعت پیدا کرنے میں مصروف ہو گئے۔

خدا کو یہ منظور ہوا کہ مسلمانوں کی سلطنت کا چراغ گل ہو اور انگریز یہاں کا نظام سنبھالیں، اور ۱۸۵۷ء کے خونخوار انقلاب کے بعد انگریز ہندوستان پر قابض ہو گئے، انگریزوں کے برسر اقتدار آجانے سے اسلامی تہذیب کے لیے بہت بڑا خطرہ درپیش ہو گیا، اگر انگریزوں کے علاوہ کوئی دوسرا برسر اقتدار آتا تو اتنا بڑا خطرہ نہ ہوتا لیکن انگریز جو زندگی کا ایک معیار، نیا اقتدار، نیا فلسفہ، نئی زندگی، نئی سائنس، نئے علوم اور زبردست وہمہ گیر مادیت لے کر آئے تھے، جن سے مسلمانوں کو زبردست خطرہ پیدا ہوا اور اسلام کی بقا کی فکر دامن گیر ہوئی۔

دینی مدارس کا قیام

پہلے علماء نے ایک ایسی جماعت تیار کر دی تھی جو سلطنت کے ختم ہونے کے بعد بھی اسلام اور تعلیمات اسلام کی حفاظت کر سکے، اس جماعت نے اسلام کی حفاظت، اسلامی تعلیمات کی بقا کے لیے مدارس کی بنیاد رکھی، ان لوگوں نے انگریزی تہذیب اور انگریزی تعلیم سے اجتناب و انحراف کیا، اور انگریزی تہذیب کا مقابلہ کیا، اور حفاظت دین کی خاطر ہی ہندوستان کے طول و

عرض میں مدارس اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، تاج المساجد اور دیگر مدارس اسی تخیل کے تحت قائم کیے گئے اور اب تک اسی تخیل کے ساتھ قائم کیے جا رہے ہیں۔

دین و اسلام کی پناہ گاہیں

یہی مدارس ہیں جو اس وقت دین کی سب سے بڑی پناہ گاہ ہیں، آج سرکاری نصاب تعلیم وقت کا سب سے بڑا خطرہ ہے، ہمارے بچوں کے دل و دماغ میں ہندو رسم و رواج کو جاگزیں کیا جا رہا ہے، یوپی، بہار، مالوہ اور مدھیہ پردیش

میں اس کے اثرات زیادہ مضر پڑ رہے ہیں، اس مسئلہ میں بھی یہ دینی مدارس ہماری بڑی مدد کر سکتے ہیں، اس لیے آپ حضرات ان مدارس کی قدر کیجیے، ایسے اداروں کی قدر کیجیے، ان کی اپنی مقدور بھر مدد کیجیے، ان کے ساتھ امکان بھر تعاون کیجیے، اور جو رائج و جائز طریقے ہیں انھیں اپنائیے کیونکہ خدا کا فرمان ہے: "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ" [سورۃ ابراہیم: ۷]۔

☆☆☆☆☆

مولانا شبیر احمد ندوی جو رحمت میں

ناظر معہد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (سکروری) جناب مولانا شبیر احمد ندوی کا تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں بروز ہفتہ ۶ جمادی الثانی ۱۴۴۳ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۲۰۲۲ء کو طویل علالت کے بعد لکھنؤ کے ایک ہسپتال میں انتقال ہو گیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم ۱۸ جون ۱۹۶۲ء کو اپنے آبائی وطن پورے حاجی خوشحال کولوا میں پیدا ہوئے، آپ کے والد مرحوم حاجی عبدالرزاق بیس سال کی عمر میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے متعلق ہو گئے تھے، اور حضرت علیہ الرحمہ کی وفات تک ان کے خادم خاص رہے، ان کے بعد حضرت علیہ الرحمہ کے جانشین ناظم ندوۃ العلماء مخدوم و مرشد حضرت مولانا سید محمد راجح حسنی ندوی مدظلہ کی خدمت میں رہے اور پوری زندگی بزرگان دین کی صحبت و خدمت میں ہی گزار دی۔

مولانا مرحوم نے مکتب کی تعلیم تکمیل کلاں دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں حاصل کی، پھر مدرسہ فلاح المسلمین میں داخلہ ہوا، وہاں سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ آئے، عالمیت (۱۹۸۰ء) و فضیلت (۱۹۸۲ء) تک کی تعلیم یہاں مکمل کی، فراغت کے بعد حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کی تربیت میں پندرہ روزہ عربی جریدہ 'الرائد' سے منسلک ہو گئے اور ۱۹۸۷ء تک وابستہ رہے، وہاں سے چند مہینوں کے لیے مکتبہ کلیۃ اللغۃ العربیۃ منتقل ہوئے اور پھر ۱۹۸۸ء میں معہد دارالعلوم میں بحیثیت مدرس تقرر ہوئی، سابق ناظر معہد ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی کی بیماری کی وجہ سے ۱۹۹۶ء میں ناظر معہد بنائے گئے، اور پھر چند برسوں کے بعد معہد احاطہ دارالعلوم سے سکروری ہر دوئی روڈ منتقل ہو گیا اور وہ پوری تندہی کے ساتھ معہد کے انتظامی و تعلیمی امور کی ذمہ داریاں سنبھالتے رہے۔

مولانا مرحوم نیک، شریف اور متواضع عالم دین تھے، خاندانی نجابت و شرافت کے ساتھ بزرگوں کی صحبتوں نے اعلیٰ اخلاق کا حامل بنا دیا تھا، وہ اساتذہ و طلبہ کے ساتھ بڑی شفقت و محبت کے ساتھ پیش آتے اور اپنے کارمفوضہ کو پوری دلچسپی اور امانت و دیانت کے ساتھ انجام دیتے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، درجات بلند کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

☆☆☆

قارئین سے دعا کی درخواست ہے۔

اصلاح حال

خواجہ معین الدین چشتیؒ اور مسلمان

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

ہیں، اس مہینہ کی بعض تاریخوں میں بہت سی پوریاں پکا کر مٹھائی کے ساتھ ایک خاص مقام پر بیٹھ کر کھانا بڑا ثواب جانتے ہیں اور بعض راتوں کو خوب روشنی کر کے جلسہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ ساری باتیں بعض انسانوں نے دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی دل سے گڑھ لی ہیں، ان میں سے کوئی شے نہ خدا کی بتائی ہوئی ہے نہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور نہ کسی صحابیؓ کی۔ بعض بزرگوں نے اس مہینہ میں چند نمازوں کا خاص ثواب لکھا ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک یہ رائے بھی صحیح نہیں لیکن اگر صحیح بھی ہو تو بہر حال نماز ہی کی فضیلت رہی، باقی تیل، بتی، گھی، شکر، میدہ وغیرہ پر روپیہ بھینکنے کا حکم کسی مستند صوفی، کسی سچے فقیر، کسی صاحب دل نے بھی کہیں نہیں دیا ہے۔ مسلمان کا کام یہ ہے کہ بری رسموں سے دوسروں کو بچائے نہ یہ کہ دوسروں کی بری رسمیں خود اختیار کرے۔

اسلامی جنتری میں اگلا مہینہ رجب کا کہلاتا ہے۔ ہندوستان میں اس کی خاص شہرت اس بنا پر ہے کہ اسی مہینہ کی چھٹی تاریخ کو یہاں کے ایک مشہور ولی خواجہ معین الدین حسن چشتیؒ نے اس دارفانی سے رحلت فرمائی تھی اور اسی مہینہ کے ابتدائی عشرہ میں ان کا عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ عرس کے موقع پر جو بہت سی مخالف شرع رسمیں انجام دی جاتی ہیں، ان پر بے شبہ ماتم کیجئے کہ آج کوئی بھی اسلامی شاعر اپنی اصلیت پر نہیں قائم ہے لیکن کیا آپ کو نفس واقعہ کی اہمیت سے انکار ہے؟ کیا خواجہؒ کی شخصیت کی عظمت آپ کے دل میں نہیں؟

.....بقیہ صفحہ ۱۳ پر

ہوتی۔ مسلمان کو اتنا نا سمجھ تو نہ ہونا چاہیے کہ اس کی ناسمجھی پر دوسری قومیں ہنسیں اور وہ دنیا میں بھی اپنا نقصان کرے اور آخرت میں بھی اس کو شرمندگی اور پچھتاوا ہو۔

مسلمان کو معراج کا مرتبہ تو خدا کے فضل و کرم سے روزانہ حاصل ہو سکتا ہے اور وہ بھی ایک بار نہیں کم از کم پانچ بار۔ اس کی معراج نماز ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں خدا کی حضوری نصیب ہوئی تھی، امت محمدی پر خدائے کریم کی یہ حد سے بڑھی ہوئی مہربانی ہے کہ اس کے ہر فرد کو دن میں کم از کم پانچ مرتبہ خدا کے دربار میں حاضری کے موقعے ہیں پس جو لوگ واقعہ معراج نبویؐ کو اس مہینہ میں مان کر اس کی زیادہ عزت و عظمت کرتے ہیں انہیں تو واجب ہے کہ اس مہینہ میں وہ خود بھی اس دولت کے حاصل کرنے کی اور زیادہ کوشش کریں اور نماز کو حضور قلب اور جماعت و طہارت کے ساتھ ادا کرنے میں پوری ہمت و مستعدی کو کام میں لائیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے دنیا میں بھی ان کے قلب کو راحت و مسرت حاصل ہوگی۔ سب بھائی بھائی امن اور چین سے رہیں گے اور آخرت میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کی دولت ہاتھ آئے گی۔

بہت سے ناواقف بھائی (اور بہنیں) رجب کی پہلی جمعرات کو بہت سی رسمیں بجالاتے

اسلامی دنیا میں اگلا مہینہ رجب کے نام سے موسوم ہے۔ ایک ضعیف روایت یہ پھیلی ہوئی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج اسی مہینہ میں ہوئی تھی۔ بہت سے مسلمان اسی روایت کو مان کر اس مہینہ میں طرح طرح کی خوشی کرتے اور بہت سی رسمیں بجالاتے ہیں۔ اول تو یہ روایت ہی ثبوت کو نہیں پہنچی ہے لیکن جو لوگ اس کے ماننے ہی پر زور دے رہے ہیں، ذرا وہ اپنے دل میں سوچیں کہ اس کے ماننے کے بعد خوشی منانے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے؟ آیا وہی جس کے وہ عادی ہیں یا کچھ اور؟ ایسا نہ ہو کہ ہم خوشی منانے کا کوئی ایسا طریقہ اختیار کر بیٹھیں جو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ناپسند کیا ہو اور ہمارے خدا کی ناخوشی کا باعث ہو۔

خوشی منانے کے دنیا میں بہت سے طریقے ہیں۔ بعض تو میں خوشی کے وقت شراب پیتی ہیں، بعض آتش بازی میں اپنا روپیہ پھونکتی ہیں لیکن مسلمان کا کام تو یہ نہیں کہ ان طریقوں سے اپنی خوشی کو ظاہر کرے۔ اس لیے کہ ہمارے سچے مذہب نے ان سب صورتوں کو ہمارے لیے منع کر دیا ہے۔ دنیا کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ ان طریقوں سے نمائش خوشی چند لمحوں کے لیے ہو جاتی ہے لیکن بعد کورنج اور تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے اور دل کی فرحت و راحت تو ایک لمحہ کے لیے بھی ان طریقوں سے نہیں

(صحبتے با اہل دل)

بچوں کی عمر کے مراحل اور ان کی نفسیات

تلاوت و اسرار حضرت مولانا سید محمد رفیع عثمانی ندوی رزاقی

ترتیب و پیشکش: محمد سلمان بجنوری ندوی

انسانی زندگی کے مراحل

اللہ تعالیٰ انسان کو اس دنیا میں مختلف ادوار اور مراحل سے گزارتا ہے، جس میں ایک مرحلہ بچپن کا ہے، ایک مرحلہ نومعمری کا ہے، ایک مرحلہ جوانی اور شباب کا ہے، ایک مرحلہ بڑھاپے کا ہے، انسان کی پیدائش سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ اس کو مختلف مراحل سے گزارتا ہے، جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کیا ہے: "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سَلَالَةٍ مِّن طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظًا مَا فَكَّسُونَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ" ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بچے کی پیدائش سے پہلے کے مراحل کا ذکر فرمایا ہے، اگر ہم اس آیت پر غور کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب حکمت اور قدرت کا مشاہدہ کریں گے۔

عمر کا پہلا مرحلہ

پیدائش سے قبل بچے کو جنین کہتے ہیں، جس وقت وہ رحم مادر میں ہوتا ہے، انگریزی زبان میں اس کو "foetus" کہتے ہیں، پیدائش کے بعد سے دو سے ڈھائی سال کی مدت بچے کے دودھ پینے کی ہے، عربی زبان میں ایسے

اپنے ماں باپ کو جو کچھ کرتا دیکھتا ہے وہی کرنے اور اس کو دہرانے کی کوشش کرتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ اگر گھر میں کوئی نماز پڑھتا ہے تو بچے بغیر کہے بغیر سکھائے نماز پڑھنے لگتے ہیں، یہ بڑی اہم بات ہے، عام طور سے اس جانب توجہ نہیں جاتی اور والدین کی کوتاہی کی وجہ سے بہت سی ایسی باتیں بچہ سیکھ لیتا ہے جو اس کے لیے نقصان دہ ہے، مثلاً ماں نے کہا بیٹا ادھر آؤ میں تم کو کچھ دوں گی بچہ دوڑ کر آتا ہے لیکن ماں کے پاس کچھ نہیں دیکھتا یقیناً چاہیے اس کے دل و دماغ میں اس بات کا کیسا اثر ہوگا جھوٹ کا عادی ہو جائے گا، اگر گھر میں قرآن کی تلاوت ہوتی ہے بچہ بھی تلاوت کا شوقین ہوگا اور اگر موبائل چلایا جاتا ہے تو بچہ بغیر موبائل کے رہ نہیں سکتا اور اس کے کتنے برے اثرات ہوں گے ہم سوچ نہیں سکتے، آجکل تو عجیب دور ہے ماںیں بچہ کو چپانے کے لیے موبائل دے دیتی ہیں، یہ کتنا خطرناک عمل ہے اندازہ لگانا مشکل ہے، اب والدین کی ذمہ داری ہے کہ جو کچھ بچوں کو سکھانا چاہتے ہیں وہ عمل ان کے سامنے کرنا شروع کر دیں اور جس فیئلڈ میں لے جانا چاہتے ہیں اسی کی تعلیم دینا شروع کر دیں، کبھی کبھی والدین سے اس سلسلہ میں کوتاہی ہو جاتی ہے وہ بچے کی نفسیات کو نہیں سمجھ پاتے، مثلاً: بچہ کا ذہن کچھ چاہتا ہے اور ہم کچھ اور چاہتے ہیں، بچہ کوئی مضمون چاہتا ہے اور ہم کوئی اور مضمون چاہتے ہیں، بچہ عصری تعلیم میں جانا چاہتا ہے اور ہم دینی تعلیم یا مدرسہ کی تعلیم دلانا چاہتے ہیں، ایسا کرنے سے کامیابی کم ناکامی زیادہ ہاتھ لگتی ہے، اگر بچے کو شوق اور دلچسپی ہے تو وہ خوب لگن سے کام کرے گا اور

بچے کو رضیع کہتے ہیں اور انگریزی میں "infant" کہتے ہیں، پھر تین سال سے چھ سات سال کی عمر کا مرحلہ ہوتا ہے، اس میں بچہ اپنے آپ کو بالکل محتاج سمجھتا ہے کہ تمام کام اس کی والدہ یا والد کرتے ہیں، وہ اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہے اور جو دل میں آتا ہے کرتا ہے، اس کے لیے عربی میں "طفل" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، انگریزی میں "kids" یا "children" کہہ دیتے ہیں، یہ بچے کی نشوونما اور تربیت کا سب سے پہلا مرحلہ ہے، اس میں سب سے بڑی ذمہ داری والدہ کی بنتی ہے کہ وہ بچے کی کس طرح تربیت کرتی ہے، کیا سکھاتی ہے، کیا پڑھاتی ہے، یہ مرحلہ ایسا ہے کہ بچے کے سامنے جو بھی بات آتی ہے، یا جو کچھ بھی اس کو بتایا جاتا ہے وہ سب اس کے ذہن نشین ہو جاتا ہے، اسی عمر میں بچہ مادری زبان سیکھتا ہے، بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ بہت کم عمر میں بچہ حافظ قرآن ہو گیا اور آپ دیکھیں گے کہ آٹھ دس سال کا بچہ بڑا ہی مہذب اور سلیقہ مند ہوتا ہے، ایسا بھی دیکھیں گے کہ اسی عمر کا بچہ بہت شرارتی ہوتا ہے، کسی کی بات نہیں مانتا، ضد بہت کرتا ہے، یہ سب فطرتاً ہی ہوتا ہے لیکن والدین کا بھی اس میں بڑا اہم کردار ہوتا ہے، یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس عمر میں بچہ

کامیاب ہوگا اور اگر نہ شوق ہے نہ دلچسپی تو وہ کچھ نہ کر سکے گا، جہاں تک تربیت کا تعلق ہے ہمارے معاشرے میں معاملہ الٹا ہے جتنا اس عمر میں بچوں کو والدین کی دیکھ ریکھ اور نگہداشت کی ضرورت ہوتی اتنا ہی والدین ان سے غفلت برتتے ہیں، نتیجتاً بچے وہ سب سیکھ لیتے ہیں جس کا والدین تصور بھی نہیں کر سکتے، یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اصل تعلیم گاہ تربیت گاہ اور سب سے پہلی درس گاہ ماں کی گود اور گھر کا ماحول ہے۔

عمر کا دوسرا مرحلہ

پہلے مرحلے میں بچے کو یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے مستقبل میں کیا بننا ہے، عمر کا دوسرا مرحلہ ۱۳ سال سے ۱۹ سال تک کا ہے یہ بڑا ہی نازک اور اہم مرحلہ ہے، اس کو عربی میں "مراهقة" اور انگریزی میں "teenage" کہتے ہیں، اس میں نفسیاتی طور پر بچے میں چڑچڑاپن اور جلد غصہ ہو جانا، کسی کی بات نہ ماننا، اپنی بات منوانے کا جذبہ ہوتا ہے، یہی مرحلہ ہے جس میں بچے کے اندر رد عمل کا اظہار شروع ہو جاتا ہے، کوئی اگر نصیحت کرتا ہے تو وہ بھی اس کو برا لگتا ہے، اب آپ سوچئے بچے کو کس طرح سے سنبھالنا ہے، کس طرح تربیت کرنا ہے، اس میں سب سے پہلی اور ضروری بات یہ ہے کہ بچے کا پہلا مرحلہ - جو دس بارہ سال پر محیط تھا - کیسا گزرا ہے، اگر والدین نے اس مرحلہ میں بچے پر پوری توجہ دی ہے اس کو وقت دیا ہے، اچھی نگہداشت کی ہے تو دوسرے مرحلے میں بچہ آسانی سے صحیح رخ پر چلے گا، معاشرے کی مسموم فضا سے زیادہ متاثر نہیں ہوگا، اس دوسرے مرحلے میں اگر بچے نے اپنا

مقصد متعین کر لیا ہے اور یہ طے کر لیا ہے کہ مستقبل میں مجھے یہ کام کرنا ہے یا فلاں منصب حاصل کرنا ہے تو وہ اپنی پوری توجہ اپنے مقصد کے حصول میں لگا دیتا ہے اور پورے انہماک کے ساتھ اپنا کام کرتا ہے، نہ وہ دوست بناتا ہے نہ دوستی کی فکر کرتا ہے، اس عمر میں نفسیاتی طور پر بچے کے اندر خود پسندی، اچھے دکھنے کی چاہت، بڑا بننے کی چاہت، دوست بنانے اور ان کے ساتھ وقت گزارنے کی چاہت پیدا ہوتی ہے، اس کا غیر سنجیدہ کاموں میں زیادہ دل لگتا ہے، بے فکری زیادہ ہوتی ہے، ٹال مٹول کرنا، کسی کی بات نہ سننا، اس مرحلے میں والدین یا اساتذہ اس طرح کے بچوں کے ساتھ زیادتی یا طیش میں کوئی کام نہ کریں بلکہ ان کو یہ احساس دلائیں کہ آپ ان کے دوست ہیں اور دوستانہ طریقہ سے ان کے ساتھ پیش آئیں ان کے جذبات مجروح نہ ہونے دیں، کوشش کریں کہ ان کے اندر احساس ذمہ داری پیدا ہو، ان کو احساس کمتری کا شکار نہ ہونے دیں، ان کو مختلف کاموں کی ذمہ داری سونپ دیں، ان کو یہ احساس ہو کہ آپ ان پر اعتماد کرتے ہیں، امید ہے کہ ایسا کرنے سے وہ راہ راست پر آجائیں اور ایک نمونہ کا کردار پیش کریں۔

عمر کا تیسرا مرحلہ

تیسرا مرحلہ انسانی زندگی کا سب سے بہترین اور خوشگوار مرحلہ ہے، جس کو ہم شباب سے تعبیر کرتے ہیں اور انگریزی میں اس کو "youth" کہتے ہیں، یہ تقریباً ۲۰ سے پینتالیس سال کے درمیان کی عمر ہوتی ہے، یہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے، اگر زندگی کا رخ

صحیح ہے اور کچھ کرنے کا جذبہ ہے، تو یہی وہ عمر ہے جس میں انسان بڑے بڑے کارنامے انجام دیتا ہے، اس عمر میں ایک جوش اور جذبہ ہوتا ہے، یہ بھی ایک اعتبار سے نازک مرحلہ ہوتا ہے، اس میں نوجوان کے ذہنی انتشار کا شکار ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، بعض نفسیاتی مریض ہو جاتے ہیں، مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں، اگر کسی میدان میں ناکام ہوتے ہیں تو ناکامی کو اپنا مقدر سمجھ لیتے ہیں، لہذا اس مرحلے میں ضروری ہے کہ سب سے پہلے اپنے آپ کو کسی اپنے معتمد اور تجربہ کار انسان کے حوالے کر دیں اور اسی کے مشورے سے اپنے تمام کام انجام دیں، کیونکہ جوش میں ہوش کی ضرورت ہوتی ہے اگر جوش ہی جوش ہے تو بڑا خطرہ ہوتا ہے کہ گاڑی پٹری سے اتر جائے، کسی کے تابع ہو کر کام کریں، اپنی قوت و طاقت یا ذہانت کو سب کچھ نہ سمجھیں، ہمارے نوجوانوں سے اسی میں غلطی ہوتی ہے، اس مرحلے میں جتنی کسی کی ماتحتی میں رہنے کی ضرورت ہوتی ہے اتنا ہی ہمارے نوجوان اس سے دور بھاگتے ہیں، یہ جو خود صحیح سمجھتے ہیں وہی کرتے ہیں، اور جو زیادہ ذہین ہوتے ہیں ان کے اندر یہ کمی زیادہ ہوتی ہے، یہ لوگ کسی کو مشیر بنانا بھی پسند نہیں کرتے، یاد رکھیے اس مرحلے میں جب نوجوان بہکتا ہے تو بہت دور تک نکل جاتا ہے، یہ چیز غیر معتبر مصنفین کی کتابوں سے بھی پیدا ہوتی ہے اس لیے مطالعہ بھی بڑوں کے مشورے سے کیا جائے۔

عمر کا چوتھا مرحلہ

یہ انسان کی عقل کے پختہ ہونے کا مرحلہ ہے، ادھیڑ عمر اس کو کہتے ہیں، عربی میں اس کو

.....بقیہ صفحہ ۱۰ ارکا

"سن الرشد" کہہ سکتے ہیں، انگریزی میں "adult" کہتے ہیں، یہ چالیس سے ساٹھ یا پینسٹھ سال تک کی عمر ہوتی ہے اس کے بعد بڑھاپا ہوتا ہے، "شیخوخة" انگریزی میں "senior citizen" کہتے ہیں، یہ عمر تو ایسی ہے کہ انسان جو کچھ اپنے شروع دور میں یا جوانی میں کرتا ہے ایک طرح سے اسی کا پھل اس کو ملتا ہے، یعنی جو بوتا ہے بڑھاپے میں اس کو کاٹا ہے، جتنی محنت کر چکا ہوتا ہے چمن میں اسی قدر بہا آتی ہے، عام طور سے ہم لوگ بزرگوں کے اخیر کے دور کو دیکھتے ہیں کہ ان کا بہت اکرام ہو رہا ہے سب لوگ ان کے منتظر ہیں، لوگ دیدار کو ترس رہے ہیں، ہمیں سوچنا چاہیے کہ یہ حضرات اپنے بچپن اور جوانی میں بڑی بڑی قربانیاں دیکر اس مقام تک پہنچے ہیں، ایسی آزمائشوں سے یہ لوگ گزرتے ہیں جن کا ہم تصور نہیں کر سکتے اور تمام مراحل صبر و شکر کے ساتھ گزار دیتے ہیں طالب علمی کا زمانہ ہو یا اس کے بعد کا زمانہ ہو، سب کچھ برداشت کر کے اس مقام پر پہنچتے ہیں، ایسے ہی لوگ کچھ کرتے ہیں، جو صرف آرام و راحت کے طالب ہوتے ہیں اور زندگی میں کبھی کوئی پریشانی نہیں دیکھتے تو وہ کوئی بڑا کام انجام نہیں دیتے، کسی بھی بزرگ کی سوانح اٹھا کر دیکھ لیں ان کی زندگی آزمائشوں سے بھری ہوتی ہے، پھر جا کر اللہ تعالیٰ ان کو نوازتا ہے۔ اب ان کے ساتھ یہ معاملہ ہو رہا ہے شروع ہی سے ان کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہوتا اور جو یوں ہی اپنی جوانی گزار دیتا ہے تو اس کے پاس حسرت و افسوس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

☆☆☆☆☆

کیا خواجہ گی زندگی اور موت دونوں کے بابرکت ہو نے میں آپ کو شبہ ہے؟ اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندوں کی زندگی اور موت دونوں بابرکت ہوتی ہیں، کیا خواجہ کی شخصیت اس قانون سے مستثنیٰ ہے؟ وہ ایک شخص تھا جس نے اپنا رشتہ ماسوا سے توڑ کر اللہ سے جوڑ رکھا تھا۔ وہ ایک شخص تھا جس کی عمر کی ایک ایک گھڑی طاعت الہی میں بسر ہوتی تھی۔ وہ ایک شخص تھا جس کی زندگی صدق و صفا، زہد و تقویٰ، عبادت و طہارت کی عملی تفسیر تھی، وہ ہندوستان میں آیا اور تنہا ایسے وقت آیا جب سارا ملک گمراہی و جہالت سے گونج رہا تھا، اس اکیلے نے بے یار و مددگار اس کفر و شرک کی سرزمین پر توحید کا جھنڈا بلند کیا۔ اس کی تبلیغ ہماری انجمنوں کی طرح نمائی نہ تھی، اس کی تبلیغ سچی تبلیغ تھی۔ اس کے سینہ سے جو سانس نکلتی تھی، تبلیغ کرتی تھی۔ اس کے جسم کا رویاں روایاں دعوت اسلام کا کام کر رہا تھا۔ اس پر بلائیں آئیں، آفتیں ٹوٹیں، مصیبتیں اٹریں لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اس سرزمین پر اسلام و توحید کا پودا لگا دیا۔ اس کے پاس نہ کوئی سرمایہ تھا نہ خزانہ، نہ فوج تھی نہ سپاہی، نہ توپ تھی نہ تلوار، نہ لکچر تھے نہ رسالے، البتہ سچائی کا سرمایہ تھا، خلوص کی فوج تھی اور صداقت کی تلوار تھی، وہ اس سچے گرو کا سچا چیلہ تھا، جو ساری دنیا کے لیے اتھاہ پریم کا ساگر بن کر آیا تھا، اس نے اپنے اسی پریم کے بل سے سب کے دلوں کو موہ لیا۔

بڑے بڑے راکشس اس کے مٹانے اور دبانے کو جھپٹے، پر آپ ہی اس سے ٹکرا کر چکنا چور ہو کر رہ گئے۔ کیا خواجہ کے زمانہ میں بھی مسلمانان

ہند کی تعداد سات کروڑ تھی؟ کیا خواجہ کے پاس بھی کسی تبلیغی انجمن کا کوئی بڑا دفتر تھا؟ کیا خواجہ بھی پوسٹروں کے ذریعہ سے تبلیغ کا کام انجام دیتے تھے؟ پھر یہ کیا ہے کہ خواجہ باوجود اس بے سروسامانی کے، باوجود اپنی تنہائی کے، باوجود بے یار و مددگار ہونے کے کامیاب ہو گئے اور ہم باوجود اپنے ذرائع و وسائل کے، باوجود اپنے اخبار و رسائل کے، باوجود اپنی انجمنوں اور اپنے دفاتروں کے، باوجود اپنی کثرت تعداد کے قدم قدم پر ناکام ہو رہے ہیں؟ کیا خواجہ گی زندگی سے ہم کوئی سبق اور ہدایت نہیں حاصل کر سکتے؟ آپ کہتے ہیں کہ خواجہ کے مزار پر جانا ناجائز ہے، اس لیے کہ وہاں بہت سے مراسم شرک ادا کیے جاتے ہیں، لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم خواجہ کے مزار پر جا کر بجائے ان سے اولاد مانگنے کے، بجائے ان سے مقدمہ میں اپنی جیت چاہنے کے، بجائے ان سے کسی بڑے عہدہ کی طلب کرنے کے، محض یہ تصور جمائیں، دل میں یہ نقشہ قائم کریں، دماغ کے اندر یہ سہارا چائیں کہ جس قادر مطلق نے بے یار و مددگار، یکہ و تہا معین الدین حسن سنجرئی سے بیکدہ ہند میں اشاعت اسلام و دعوت توحید کا کام لیا، وہی ہماری نیتوں میں خلوص، ہمارے دلوں میں ایمان، ہماری ہمتوں میں استقامت نصیب کرے اور جو فیضان الہی اجیر کے اس اچھے اور سچے بندہ کے حصہ میں آیا تھا، کاش اس کا عشر عشیر، اس کا کوئی ادنیٰ حصہ بھی ہم بدکار و خطا شعار بندوں کے حصہ میں آجائے! کیا یہ تصور بھی مشرکانہ ہے؟ کیا دل میں اس آرزو کا پیدا ہونا، اور لب پر اس دعا کا آنا بھی کوئی جرم، کوئی معصیت ہے!؟

☆☆☆☆☆

اسلامی تہذیب میں انسانی حقوق کی پاسداری

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی

فرشتوں کے روبرو کر دیں اور فرمایا: تِلَاوِ جِصَّانِ
کے اسماء اگر تم سچے ہو۔

بلاشبہ علم و معرفت کے تعلق سے اللہ رب
العزت اور ملائکہ کے درمیان کی گفتگو خدائی
تہذیب کی پہلی اساس ہے، انسان اسی خدائی
تہذیب کا حاجت مند ہے اور کائنات اور انسانی
زندگی کا راز اس میں مضمر ہے اور انسانیت کی
نجات بھی اس پر موقوف ہے، یہ ایک ناقابل انکار
حقیقت ہے کہ علم ہی تہذیب کی بنیاد اور اس کی جڑ
ہے اور معاشرہ کی تعمیر میں حِثِّتِ اول کی حیثیت
رکھتا ہے، اسی وجہ سے اسلام نے علم کے مقام کو
بہت بلند کیا ہے اور اس کے حصول کے لیے تمام
ممکن الحصول وسائل اختیار کرنے کی دعوت دی
ہے، آقائے مدنی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو علم کی اہمیت پر
زور دیا گیا اور اس کی وضاحت بھی کی گئی کہ
تہذیب کا مکملہ تعلیم و تربیت ہے۔

علامہ ابن قیم تحریر فرماتے ہیں کہ علم کی دو
قسمیں ہیں: ۱- فرض عین، ۲- فرض کفایہ۔
فرض عین وہ علم ہے جس کا حاصل کرنا انسان
پر ضروری ہے، اس کی چند قسمیں ہیں:

۱- پانچ چیزوں پر ایمان لانے کا علم جیسے اللہ
پر ایمان لانا، فرشتوں، رسولوں، نازل شدہ
کتابوں اور روز جزاء پر ایمان لانا، جو شخص ان
پانچ چیزوں پر ایمان نہیں لاتا ہے وہ مؤمن نہیں
کہلائے گا۔

۲- اسلامی قوانین اور آداب و ضوابط کا جاننا
جیسے وضو کرنے کا طریقہ معلوم ہونا، نماز، روزہ، حج
اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے شرائط سے واقف ہونا۔

۳- شریعت اسلامیہ میں جو پانچ چیزیں

اسلامی تہذیب ایک عطیہ ربانی ہے جو
فطرت انسانی کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہے اور
اس میں انسانیت کی کامیابی کا راز پنہاں ہے،
اور زندگی کے مادی، روحانی، علمی، فکری،
معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں پر مشتمل
ہے، اللہ رب العزت نے سیدنا آدم علیہ السلام
کی خلافت ارضی کے توسط سے انسانوں کو اس
سے نوازا ہے، خلافت ارضی کے متعلق قرآن
کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”وَ إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ
فِی الْاَرْضِ خٰلِیْفَةً، قَالُوْۤا اَنْتَ جَعَلْ فِیْهَا مَنْ
یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ، وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ
بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ، قَالَ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ، وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ
عَرَضَهُمْ عَلٰی الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِیْ
بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ“ [سورہ
بقرہ: ۳۰] (اور جب آپ کے رب نے فرشتوں
سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ ضرور بناؤں
گا، فرشتے کہنے لگے آپ زمین میں ایسے لوگوں کو
پیدا کریں گے جو فساد کریں گے اور خونریزی
کریں گے، حالانکہ ہم برابر تسبیح کرتے رہتے
ہیں اور آپ کی تقدیس کرتے رہتے ہیں، حق
تعالیٰ نے فرمایا: میں اُس بات کو جانتا ہوں جو تم
نہیں جانتے، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ
السلام کو تمام چیزوں کا علم دیا، پھر وہ چیزیں

روئے زمین کے اکثر باشندے سائنس و
تکنالوجی کے اس دور میں زندگی اور معاشرہ
انسانی کی ترقی کے لیے مغربی تہذیب کو اصل
قائد و رہنما تصور کر بیٹھے ہیں، تہذیب حاضر کے
متوالوں کا یہ تصور اس سے ان کی گہری دلچسپی کی
طرف اشارہ کر رہا ہے، اس کے اکرام و احترام
کے وہ اسی طرح قائل ہو چکے ہیں، جس طرح
انہوں نے خاک و وطن، رنگ و نسل کو مقدس سمجھ
رکھا ہے، اہل یورپ نے تو مختلف قدیم ثقافتوں کو
مقدس سمجھا، اسے اپنی زندگی میں برتا اور سائنسی و
فکری میدانوں میں ناکام مغربی اقوام ملل کے
نمائندے اس کے شانہ بہ شانہ چلے، اور اس کی
نافیعت کی ایسی صدا لگائی جس کی صدائے
بازگشت دنیا کے چپے چپے میں سنی گئی، اور بطور دلیل
خود ساختہ تاریخی واقعات کو پیش کیا، یہ عمل اس
وقت سے بحسن و خوبی انجام پانے لگا، جب
یورپ اپنی گہری نیند سے بیدار ہوا، اور بالخصوص
جب یورپ نے اسپین میں مسلمانوں کے علمی
سرمایہ اور مختلف شعبہ ہائے زندگی پر اسلامی کلچر و
ثقافت کا بغور مطالعہ کیا تو اس کی نگاہیں خیرہ ہو
کر رہ گئیں، ارسطو کے دور کے متروک علمی سرمایہ
کے ضائع ہونے پر انہیں افسوس نہیں ہوا، اور وہ
اپنی غفلت و کوتاہی پر ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوئے،
آج یورپ جو علمی ترقی میں فوقیت و برتری رکھتا
ہے وہ سب اسلامی تہذیب ہی کی دین ہے۔

حرام ہیں ان کا علم ہونا۔

ان پانچ چیزوں کو قرآنی آیات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

”قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ ، وَإِنَّكُمْ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ، وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ“ [سورہ اعراف: ۳۳] (آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمادیجیے! میرے رب نے تمام فحش باتوں کو حرام کیا ہے، ان میں جو اعلانیہ ہوں وہ بھی اور ان میں جو پوشیدہ ہوں وہ بھی، اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو، اور اس بات کو کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ تعالیٰ نے کوئی سند نازل نہیں فرمائی اور اس بات کو کہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگا دو جس کی تم سند نہ رکھو۔

۴- معاشرتی اور اقتصادی مسائل کا علم ہونا۔
۲- فرض کفایہ وہ ہے جس کا حاصل کرنا سب پر ضروری نہیں، بلکہ اگر اس کو چند افراد حاصل کر لیں تو دوسرے لوگوں سے ساقط ہو جاتا ہے، اور وہ یہ ہے جس سے قوم کی مادی ترقی وابستہ ہو، جیسے ڈاکٹری، ریاضیات، انجینئرنگ، زمین کی پیمائش، کاشتکاری، بنائی، لوہاری، فنکاری، تجارت اور اس کے علاوہ دیگر علوم ہیں، امت کی ایک جماعت کو ان کے حصول کے لیے تن من و دھن کی بازی لگا دینی چاہیے، تاکہ قوم کی اقتصادی و معاشی صورت حال مستحکم ہو، اور دوسری قوموں سے معاملاتی تعلقات استوار ہو سکیں۔

امام غزالی تحریر فرماتے ہیں کہ فرض عین کے تحت عبادات، اخلاقیات اور کبیرہ گناہوں سے

اجتناب جیسے مسائل آتے ہیں اور یہ اعمال انسان کی ذاتی شخصیت سے متعلق ہیں، جہاں تک فرض کفایہ کا تعلق ہے تو اس کے تحت امن وامان کے قیام، لوگوں کے مابین صلح و صفائی کا اہتمام، عہدے اور مناصب کی انجام دہی اور ایسے علوم میں مہارت و کمال اور کارگیری داخل ہے جس سے قوم و ملت باسانی عروج پر پہنچے اور دنیا کے تمام باشندے چین و سکون کی ٹھنڈی سانس لے سکیں، اسی وجہ سے فرض کفایہ کے سلسلہ میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ: ”جب قوم کے کچھ افراد اس کو انجام دے دیں تو باقی لوگوں سے ساقط ہو جاتا ہے۔“

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو معاشرہ ان علمی عناصر سے تشکیل پائے گا، وہ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہوگا، ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا، امن وامان کی فضا پیدا ہوگی، نیک بختی اور خیر و سلامتی کا دور دورہ ہوگا، لوگوں کے تعلقات ایک دوسرے سے مستحکم ہوں گے، باہم الفت و محبت اور ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا ہوگا اور خدائے وحدہ لا شریک سے لوگوں کا تعلق مضبوط ہوتا چلا جائے گا، ہدایت کے راستے کھلتے چلے جائیں گے اور انسان اپنے جملہ اعمال میں اللہ ہی سے لو لگائے گا، اسی کو مشکل کشا اور خالق و رازق سمجھے گا، اخلاقی اور معاشرتی امراض سے پاک و صاف ہوگا اور ظلم و زیادتی اور حق تلفی سے اس کو غایت درجہ نفرت ہوگی۔

اس وقت لوگوں کے سامنے یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ یہ تہذیب و ثقافت انسانی حقوق کی پاسداری کی داعی ہے، حقوق اللہ کی بجا آوری پر ابھارنے والی ہے، ظلم و تشدد، بے گناہوں کے ساتھ قتل و غارتگری اور انسانی معاشرے

میں شر و فساد کی تخم ریزی کی شدید مخالف ہے، اس تہذیب کی فطرت تعمیر ہے تخریب نہیں، محبت ہے عداوت نہیں، انصاف پسندی ہے نا انصافی نہیں، اس کے بالمقابل دنیا کی مادی تہذیبیں اور موقع پرستی پر مبنی نظریات وغیرہ سب قابل مذمت ہیں، کیونکہ ان نظریات میں انسانی منافع و مصالح کی پاسداری کا ذرا بھی لحاظ نہیں، ان میں اعتدال و توازن مفقود ہے، غم خواری اور رحم و کرم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

آقائے مدنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے معاشرہ کی تعمیر کی مثال اپنے علم و حکمت اور نور و ہدایت سے دی تھی اور کہا تھا کہ: ”اللہ رب العزت نے جو علم و ہنر اور نور و ہدایت مجھے دے کر بھیجا ہے، اس کی مثال اس بارش کے پانی کی طرح ہے جو کسی زمین پر خوب خوب برسے، اس زمین کا ایک حصہ زرخیز اور شاداب تھا تو پانی اندر جذب ہو گیا جس سے پوری زمین سرسبزی سے لہلہا اٹھی، اور دوسرا حصہ خشک اور بہت سخت تھا جس نے پانی ذرا بھی جذب نہیں کیا، سطح زمین پر وہ پانی باقی رہا، لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، اپنے مویشیوں اور چوپاؤں کو خوب پلایا اور پھر اس سے آبپاشی بھی کی، تیسرا حصہ وہ تھا جس نے پانی ذرا بھی نہیں جذب کیا، بلکہ یوں ہی ضائع ہو گیا، پہلی اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے میری تعلیمات سے فائدہ اٹھایا، خود عمل کیا اور دوسروں کو عمل کی ترغیب بھی دی، اور تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے میری تعلیمات کی طرف ذرہ برابر بھی توجہ نہیں دی اور جس ہدایت کو لے کر میں مبعوث کیا گیا ہوں اس کو قبول نہیں کیا۔“

اسلامی معاشرہ ایمان و عمل کے بہترین

صرف ایک خدا کی غلامی

مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ

ایک دوسری چیز استعانت ہے یعنی مدد چاہنا، یہ انسان کی زندگی کا دوسرا اہم ستون ہے، اگر وہ غیر اللہ کی عبادت سے نکل بھی آتا ہے تو اکثر یہاں آکر پھنس جاتا ہے، یعنی موحد ہونے، خدا کی عبادت کرنے اور اس کو اپنا مالک و آقا سمجھنے کے باوجود وہ یہ سمجھتا ہے کہ دوسروں کے ہاتھ میں بھی بہت کچھ ہے اور ان سے بھی مدد چاہ سکتا ہے، یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ استعانت دو قسم کی ہے، ایک جس پر زندگی کا نظام قائم ہے، اور جو خالص انتظامی معاملہ ہے، مثلاً ہم بیمار ہوتے ہیں تو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں، ملازمت کرتے ہیں، لیتے دیتے ہیں، کسی بزرگ مرد صالح سے دعا کے لیے کہتے ہیں، ایک وہ جس میں کسی کو مشکل کشا اور کارساز سمجھا جائے، مثلاً فلاں بزرگ ہماری مشکل دور کر سکتے ہیں، فلاں حاکم چاہے تو ہماری قسمت کا ستارہ چمک سکتا ہے، فلاں آدمی بھی نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے، فلاں نفع پہنچانے پر قادر ہے، یہ مدد چاہنے کی وہ شکل ہے جو غلط ہے اور ”ایاک نستعین“ کے صریح خلاف ہے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ غیر اللہ کی عبادت سے زیادہ غیر اللہ سے مدد چاہنا زندگی میں عام ہے، آدمی ہر نماز میں اور ہر رکعت میں یہ کہتا ہے کہ ”ایاک نعبد و ایاک نستعین“ لیکن وہ اس وقت جب مسجد سے باہر ہوتا ہے تو حاکم کے ڈر سے سچی بات نہیں کہتا یا کسی فائدے اور ترقی کے لالچ میں اس کے سامنے بالکل بھٹکنے لگتا ہے اور عزت نفس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اس کے دل میں چور ہوتا ہے، کہ یہ چاہیں تو ہمارا کیس خراب کر سکتے ہیں اور اب تو یہ کہا جانے لگا ہے کہ ہمارا فیوچر (مستقبل) خراب کر سکتے ہیں، اس طرح کی بات کرنا یا سوچنا اور دل میں اس کا یقین رکھنا یہی دراصل غیر اللہ سے مدد چاہنا ہے، بدعت کی اکثر قسمیں چڑھاوے، قبر کی قسمیں، یہ سب اسی استعانت میں داخل ہیں، اسی طرح سیاسی و اجتماعی زندگی میں اہل حکومت اور اہل دولت کو نفع و نقصان کا مالک اور مستقبل خراب کر دینے پر قادر سمجھنا اور یہ سمجھنا کہ سفارش ہی سب کچھ ہے، خوشامد سے سارے کام بنتے ہیں، اور ان لوگوں کے ہاتھ میں بہت کچھ ہے، استعانت کی وہ شکل ہے جو ایک سچے مسلمان کی زندگی سے بالکل میل نہیں کھاتی۔

قرآن مجید میں عبادت اور استعانت دونوں چیزوں میں غیر اللہ کی مکمل نفی کر کے انسان کو ہر طرح کی غلامی سے آزاد کر دیا ہے، اور صرف ایک خدا کی غلامی میں داخل کیا ہے جو حقیقتاً ہر چیز پر قادر ہے، یہ جس کے بعد ایک معمولی اور عام مسلمان دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہ، اور ڈکٹیٹر اور حاکم کے سامنے مرعوب نہیں ہو سکتا۔

☆☆☆

امتزاج کا معاشرہ ہے، جسم و روح کے اجتماع کا معاشرہ ہے، دین و دنیا کی نیکیوں سے نوازنے والا معاشرہ ہے، اس میں زندگی کے جملہ شعبہ جات کا حل موجود ہے، سختی و نرمی، راحت و آسانی، خوشحالی و پریشانی، صلح و آشتی، جنگ و جدال اور معرکہ آرائی، فقر و محتاجی اور دولت و مالداری، غرض یہ کہ ہر درد کا درماں اور ہر ہر کا تریاق اسی اسلامی تہذیب میں موجود ہے۔ اس لیے یہ تہذیب ایک نمونہ والی تہذیب ہے اور تاقیامت رہے گی، ایسا اس وجہ سے کہ یہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔

”فَطَرَهُ اللَّهُ الَّذِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ“ [روم: ۳۰] (یہ اللہ کی تخلیق کردہ فطرت ہے، جس پر اس نے لوگوں کو وجود بخشا ہے، اور اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلامی تہذیب ہی معاشرہ کی تعمیر میں قائدانہ کردار ادا کر سکتی ہے، کیونکہ اس کی سرحد علم و ایمان سے ملتی ہے، اخلاقی قدریں اس کے ماتحت ہیں اور ہر زمان و مکان کے ساتھ ہم آہنگ اور سیدھے راستہ کی رہنمائی اسی میں ہے:

”وَأَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ، ذَلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ“ [سورۃ انعام: ۱۵۳] (اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے تو تم اسی پر چلنا اور دوسرے راستوں پر نہ چلنا، (ان پر چل کر) خدا کے راستے سے الگ ہو جاؤ گے، ان باتوں کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ تم پر ہیزار گار بنو)۔

☆☆☆☆☆

ملت کی سرفرازی و سرخروئی کا ذریعہ بنیں!

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

کر رہی ہیں، یقیناً ان کو بدبختی کہا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے علم کی خصوصیت یہ رکھی ہے کہ جیسے ایمان انسان کے لیے بلندی کا ذریعہ ہے، اسی طرح علم بھی افراد اور قوموں کی سر بلندی و سرخروئی کی کلید ہے: يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ [مجادلہ: ۱۱] جو لوگ علم سے آراستہ ہوں یا جو قوم علم و دانش کی دولت سے مالا مال ہو، وہ اور جو افراد اور قومیں علم سے محروم ہوں، دونوں برابر نہیں ہو سکتے: قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ [الزمر: ۹] علم کی ضرورت جہاں آخرت کی کامیابی کے لیے ہے، وہیں دنیا میں باعزت زندگی گزارنے اور بہتر مرتبہ و مقام حاصل کرنے کے لیے بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو نبوت کے ساتھ ساتھ حکومت اور حکمرانی کے سلیقہ سے بھی نوازا تھا اور مخلوقات سے متعلق بعض ایسے علوم دیے گئے تھے، جہاں تک عام انسانوں کی رسائی نہیں ہوتی، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ علم کی اس دولت سے نوازا کر اللہ نے ہمیں بہت سارے مسلمان بندوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے: وَقَالَا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلَى كَثِيرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ [النمل: ۵۱]۔

دنیا میں اقتدار میں شرکت، کاروبار حکومت میں شمولیت اور نظم و نسق کی انجام دہی میں بھی علمی بصیرت اور معلومات کا مہیا ہونا ضروری ہے، اسی لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے جب مصر کے حکمران سے پیشکش کی کہ جو

آ رہا ہے اور جو قیامت تک آتا رہے گا، جن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے انسان مختلف ناموں سے موسوم کرتا ہے، ان ساری چیزوں کا علم حضرت آدم علیہ السلام کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے، جن کا ہر دور کی ضرورت کے اعتبار سے ظہور ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

اسلام کی نظر میں بنیادی طور پر علم کی دو قسمیں ہیں، ایک: وہ علم جو انسان کے لیے نفع بخش ہو، خواہ دنیا کے لیے ہو یا آخرت کے لیے اور دوسرے: وہ علم جو بے فائدہ ہو، پہلا علم مطلوب ہے اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور دوسری قسم کا علم مذموم اور ناپسندیدہ ہے؛ چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے علم نافع کی دُعا کیا کرو اور بے فائدہ علم سے اللہ کی پناہ چاہو: "سَلُوا عِلْمًا نَّافِعًا، وَتَعَوَّذُوا بِاللَّهِ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ" [سنن ابن ماجہ، عن عبد اللہ بن جابر، حدیث نمبر: ۳۸۴۳]، آج کل انسان کی ہلاکت و بربادی اور دنیا کو تباہ و تاراج کرنے کے جو ہتھیار تیار کیے جا رہے ہیں، یہ یقیناً بے فائدہ علم میں شامل ہیں اور سوائے اس کے کہ کوئی ملک دفاع کے لیے اس پر مجبور ہو جائے، اس کو اپنے وسائل تعمیری مقاصد کے بجائے ایسے تخریبی کاموں میں خرچ نہیں کرنا چاہیے، مغربی طاقتیں جس طرح اپنی بہترین صلاحیتیں مہلک ہتھیاروں کے بنانے میں خرچ

اللہ تعالیٰ نے دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں انسان کو جن امتیازی صلاحیتوں سے نوازا ہے، ان میں سے ایک اہم صفت یہ ہے کہ اس کے اندر علم کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہے، علم کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود اپنی صفت علم کا کم سے کم دو سو بارہ مواقع پر ذکر فرمایا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کو جو اس دنیا کی خلافت عطا کی گئی ہے، وہ اسی لیے کہ ان کے اندر معلومات کو اخذ کرنے کی صلاحیت تھی؛ چنانچہ حق تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کے ساتھ ان کا امتحان لیا گیا اور بارگاہ الہی میں ہونے والے اس امتحان میں پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کامیابی سے ہمکنار ہوئے، حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ کی جانب سے کن کن چیزوں کا علم عطا فرمایا گیا تھا؟ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں مختصر لیکن جامع بات کہی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء (ناموں) کے علم سے نوازا گیا تھا: وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا [بقرہ: ۳۱] اسم کے معنی تو صرف نام کے ہیں جو کسی شے کی نشاندہی کرتی ہے؛ لیکن بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد صرف نام نہیں ہے؛ بلکہ کائنات کی وہ تمام چیزیں ہیں، جن کے نام رکھے جاسکتے ہیں، گویا علم کا جو مخفی خزانہ جہالت کے پردے سے نکل نکل کر باہر

اقتصادی بحران مستقبل میں آنے والا ہے اور جو بظاہر پورے ملک کو دانہ دانہ کا محتاج بنا دے گا، اس سے نبرد آزما ہونے کے سلسلہ میں، میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں اور آپ کے خزانہ کی ذمہ داری سنبھال سکتا ہوں، تو اس پیشکش کے ساتھ آپ نے یہ دلیل دی کہ میرے اندر سرکاری خزانے کی حفاظت و نگہداشت کی صلاحیت بھی ہے اور میں علم کی دولت سے بہرہ ور بھی ہوں: اَجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ [یوسف: ۵۵]۔

حکومت و اقتدار کی اہمیت ہر ملک میں ہے؛ لیکن جہاں مسلمان اقلیت کی حیثیت سے رہتے ہوں، وہاں اقتدار میں ساجھے داری اور سرکاری نظم و نسق میں شمولیت مسلمانوں کے ملی بقاء کے لیے بے حد ضروری ہے؛ کیوں کہ عام طور پر اکثریت چاہتی ہے کہ وہ اقلیت کو ہضم کر جائے، اس کے تشخص کو مٹا دے، تعلیمی اور معاشی اعتبار سے اس کو پنپنے کا موقع نہیں دے، ہندوستان میں مسلمان اس وقت اسی صورت حال سے دوچار ہیں، ان کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی ضرب المثل بن چکی ہے، جس قوم نے اس ملک پر صدیوں حکومت کی، وہ آج ایک بے توقیر گروہ کی حیثیت سے زندگی کا سفر طے کر رہی ہے، اس صورت حال سے نکلنے کے لیے جہاں دین سے گہری وابستگی اور باہمی اتحاد ضروری ہے، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اُمت علم و تحقیق کے میدان میں آگے بڑھے اور زندگی کے مختلف میدانوں میں مؤثر کردار ادا کرنے کے لائق بن جائے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ مسلمان

مختلف حادثات سے سبق حاصل کرتے رہے ہیں اور جب بھی کوئی مصیبت اس پر آئی ہے، غم زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک نئے حوصلہ کے ساتھ قدم بڑھایا ہے، تقسیم ہند کے بعد سے جب فرقہ وارانہ حملہ شروع ہوا، پولیس اور فساد یوں نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا سلسلہ شروع کیا، تو ۱۹۷۱ء تک مسلمانوں کی یہ کیفیت رہی کہ لوگ فساد یوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے راہ فرار اختیار کرتے اور بہت سی دفعہ ان کی منزل موجودہ بنگلہ دیش کی سرزمین ہوتی، وہ اس کو اپنے لیے ایک گوشہ عافیت تصور کرتے؛ لیکن جب پاکستان کی ناعاقبت اندیشی کے نتیجے میں بنگلہ دیش بن گیا تو انھوں نے محسوس کر لیا کہ بہر حال ان کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے؛ اس لیے انھوں نے حوصلہ و ہمت کو جمع کیا اور اس کی وجہ سے فسادات کے نتائج اور آبادی کے ارتکاز میں ایک مثبت تبدیلی ظاہر ہونے لگی، پھر ۱۹۷۲ء میں جب حکومت ہند نے متنبی سے متعلق ایک ایسا قانون لانے کی کوشش کی جو شریعت اسلامی سے متصادم تھا اور مسلمانوں نے محسوس کیا کہ حکومت جان و مال کے بعد اب مسلمانوں کے دین و شریعت پر بھی ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے، تو انھوں نے اپنے باہمی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ساتھ بیٹھنے اور مشترکہ مسائل کے لیے متحدہ جدوجہد کرنے کا سبق سیکھا اور اس طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسا متحدہ پلیٹ فارم وجود میں آیا۔

۱۹۹۲ء میں بابر مسجد کی شہادت کا وہ

اندوہ ناک واقعہ پیش آیا، جس نے پوری ملت

اسلامیہ کو ہلا کر رکھ دیا، ان حادثات کے بعد مسلمانوں نے ایک نئی کروٹ لی، انھوں نے محسوس کیا کہ ان کو قصداً انصاف سے محروم رکھا جاتا ہے اور وہ خود اپنی جدوجہد کے ذریعہ ہی اس ملک میں ایک باوقار اُمت کی حیثیت سے زندگی گزار سکتے ہیں؛ چنانچہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیمی اور معاشی جدوجہد شروع ہوئی، مسلمانوں نے سرکاری ملازمت پر تکیہ کرنے کے بجائے تجارت، چھوٹی صنعت اور بیرون ملک ملازمت پر توجہ دی، غیر سودی قرض کے ادارے قائم کیے اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کو روزگار کے اعتبار سے خود کفالی بنانے کی کوششیں کی گئیں، بجز اللہ ان کوششوں کے بہتر اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

تعلیم کی طرف بھی مسلمانوں کی توجہ بڑھی ہے، انھوں نے پرائمری سے لے کر ڈگری اور پی جی کی سطح کے ہزاروں ادارے قائم کیے ہیں، ملک کے مختلف حصوں میں اور خاص کر جنوبی ہند میں پیشہ ورانہ تعلیم کے بہت سے ادارے قائم کیے، اب ہزاروں کی تعداد میں مسلمان طلبہ میڈیکل، انجینئرنگ، ایم بی اے، ایم سی اے اور آئی ٹی وغیرہ کی سندس لے کر نکل رہے ہیں، اگرچہ اعلیٰ تعلیم کے بیشتر ادارے ملک کے جنوبی علاقہ میں قائم ہیں؛ لیکن ان کا فائدہ پورے ملک کے نوجوان مسلمانوں کو پہنچ رہا ہے، یہ یقیناً ایک خوش آئند بات ہے اور امید ہے کہ مستقبل میں اس کے بہتر اثرات مرتب ہوں گے۔

لیکن غور کرنے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ عصری تعلیم کے جن شعبوں کی طرف مسلمانوں کی توجہ بڑھی ہے، عام طور پر اس کا فائدہ ان کی

ذات یا ان کے خاندان کو پہنچ سکے گا، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دور میں خاندان کا تصور بہت محدود ہو گیا ہے، بیوی بچوں کے سوا بمشکل والدین کو اس میں شامل کیا جاتا ہے، بھائی بہن کا تو ذکر ہی کیا ہے، تعلیم کے ان شعبوں سے فارغ ہونے والے نوجوان اپنے آپ کو سکھ ڈھالنے کی مشین سمجھتے ہیں، قومی و ملی مسائل سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا؛ اس لیے یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی تعلیم ملت کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا رہی ہے؛ بلکہ جو لوگ ایسے نوجوانوں پر بطور تعاون اپنا سرمایہ خرچ کرتے ہیں، وہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ ملک کا جو سرمایہ ان پر خرچ کیا جا رہا ہے، ملت کو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے اور ایک ایسا گروہ تیار ہو رہا ہے جس کی اکثریت خود غرضی اور مادہ پرستی میں مبتلا ہو جاتی ہے، کاش کہ جو تنظیمیں تعلیم کے ان شعبوں میں نوجوانوں کو امداد فراہم کرتی ہیں، وہ ان کی اخلاقی اور فطری تربیت کی طرف بھی توجہ دیں۔

لیکن اس وقت ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ عصری تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو ان شعبوں میں لایا جائے، جو فکر سازی، ملت کے مسائل کی ترجمانی، انصاف کے حصول اور ان کے نظم و نسق میں شمولیت کو آسان بنا سکیں، اس سلسلہ میں خصوصی طور پر بعض شعبوں کا ذکر کرنا مناسب ہوگا، جیسے قانون کا شعبہ ہے، سپریم کورٹ میں اچھے مسلم وکلاء جن کا عدالت میں وزن محسوس کیا جائے، نہ کے برابر ہیں، ہائی کورٹوں کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے؛ اسی لیے عدالتوں میں مسلمان ججس کی تعداد کم

ہوتی جا رہی ہے، بعض لوگوں کا احساس ہے کہ ملک کا یہ سب سے معزز ترین ادارہ فرقہ پرستی کے زہر سے مسموم ہوتا جا رہا ہے اور بعض دفعہ انصاف کو شرم سار ہونا پڑتا ہے، اگر قانون کے شعبہ میں ہماری موثر نمائندگی نہیں رہے گی تو ہمارے لیے انصاف کی جنگ جیتنا دشوار سے دشوار تر ہوتا چلا جائے گا۔

اسی طرح موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ، بالخصوص انگریزی اور مقامی زبان کے میڈیا کی بڑی اہمیت ہے، اس کے بغیر پروپیگنڈہ کی جنگ میں عزت و آبرو کا بچانا مشکل ہے، ایسے انگریزی دانوں کی بھی ضرورت ہے، جن کو انگریزی کے معتبر ادیب اور مصنف کا درجہ حاصل ہو اور قومی سطح پر ان کو پذیرائی حاصل ہو، ڈاکٹر جسم کا علاج کر سکتا ہے، انجینئر بلڈنگیں اور مشینیں بنا سکتا ہے؛ لیکن فکر سازی کا کام اچھے جرنلسٹ اور باصلاحیت مصنف اور ماہر تاریخ داں کے ذریعہ ہی انجام پا سکتا ہے؛ لیکن ان شعبوں سے مسلمان طلبہ کٹے ہوئے ہیں اور اسی لیے مسلمانوں میں عصری علوم کے حامل ایسے ماہرین نہیں رہے، جو مسلمانوں کے نقطہ نظر کو دلیل، زبان و بیان کی قوت، منطقی و معقولیت اور خوش سلیمانی کے ساتھ پیش کر سکیں، ذرائع ابلاغ مسلمانوں کے تئیں ایسا کردار ادا کرتے ہیں کہ گویا وہ مسلمانوں کے بالمقابل اپوزیشن ہوں، تاریخ ایسی مرتب کی جا رہی ہے جس میں مسلمانوں سے متعلق نفرت کے جذبات ابھارے جا رہے ہیں، زبان و بیان کے اعتبار سے معیاری اور مقبول کتابیں اس انداز کی آرہی ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط

فہمیوں کو جنم دیتی ہیں۔

خاص طور پر رسول سروسز کا ذکر کروں گا، جس میں مسلمانوں کا تناسب نہایت حقیر ہے اور یہ تعداد کی کمی اس لیے نہیں ہے کہ مسلمان کی زیادہ تعداد شریک ہوتی ہو اور نسبتاً کم تعداد کا میاب ہوتی ہو؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امتحان میں شریک ہونے والے مسلمان امیدواروں ہی کی تعداد کم ہوتی ہے اور شرکت کے اعتبار سے کامیابی کا تناسب عام طور پر وہی ہوتا ہے، جو اکثریت کا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ ”کم صلاحیت“ ہونے کا نہیں ہے؛ بلکہ کم ہمتی، پست حوصلگی اور جدوجہد میں کمی کا ہے، نیز مزاج یہ بن گیا ہے کہ اعلیٰ ترین منزل پر پہنچنے کے بجائے اسی مرحلہ پر اکتفا کر لیا جائے، جس سے کمائی ہونے لگے اور مرفہ الحالی حاصل ہو جائے؛ حالانکہ جو لوگ اس مقام تک پہنچتے ہیں، وہ ملت کو انصاف دلانے میں ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں اور سیاسی نمائندوں سے بھی بڑھ کر وہ قوم و ملت کے لیے اپنی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

اس لیے ضرورت ہے کہ اب تعلیم کے ان شعبوں کی طرف توجہ دی جائے، نوجوانوں کی اس سلسلہ میں حوصلہ افزائی کی جائے اور انھیں اس لائق بنایا جائے کہ ان کی صلاحیت کا فائدہ صرف ان کی ذات یا ان کے خاندان تک محدود نہ رہے؛ بلکہ پوری ملت کو ان کا نفع پہنچے، وہ صرف نوٹ چھاپنے والی مشین بن کر نہ رہ جائیں؛ بلکہ وہ ملت کی سرفرازی و سرخروئی کا ذریعہ بنیں۔

☆☆☆☆☆

کامیاب زندگی کی ضمانت

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

جذبات، دل اور انسانی ضمیر سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ایسی زندگی اسلام کی نظر میں پسندیدہ ہے بلکہ اسلام انسانوں سے جس پاکیزہ زندگی کا متقاضی اور داعی ہے، وہ ایک ایسی جامع زندگی ہے جو عقلا نیت و مادیت کا حسین سنگم ہے، اس میں قلب و روح کی جامعیت ہے اور احساسات و جذبات اور فکر و عمل کا بہترین امتزاج ہے، اسلام کا یہی وہ طرز زندگی ہے جو دوسروں کی دل داری، ہر انسان کو آرام پہنچانے اور خالق حقیقی سے انسانوں کا رشتہ جوڑنے سے عبارت ہے۔

اسلامی طرز زندگی کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں دل کی حیثیت بادشاہ کی اور عقل کی حیثیت وکیل کی ہے، اس میں جذبات کی رعایت ہے اور شریعت مطہرہ کے مطابق انسانی تقاضوں کا مکمل خیال رکھا گیا ہے۔ رواداری و غم خواری، ہم دردی و رحم دلی، عدل و احسان، انخت و محبت، ایثار و خیر خواہی، اخلاص و قربانی، اسلامی طرز زندگی کے جلی عنایں ہیں۔ یہی وہ جامع دستور حیات ہے جس کو دین اسلام نے وضع کیا ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کے اندر ایک مبارک و کامیاب زندگی کے تمام عناصر اعتدال کے ساتھ ودیعت کر دیے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اسی طرز زندگی کو اپنائیں، اس پر سو فیصد عمل کی کوشش کریں اور اپنی عملی زندگی میں مذکورہ عناصر کا پاس رکھیں، جن کے بغیر ایک با مقصد، پرسکون اور خوش حال زندگی کا تصور ممکن نہیں۔

(ترجمانی: محمد مرغان بدایونی ندوی)

☆☆☆☆☆

کھانے میں لذیذ ترین ڈشیں ہوں، رہنے کے لیے ٹائلز اور سنگ مرمر سے بنا عالی شان بنگلہ ہو، جس کی دیواروں پر ریشم کے پردے ہوں اور بیٹھک میں نرم صوفے پڑے ہوں، نیز چلنے کے لیے نئے سے نئے ماڈل کی مرسیڈیز گاڑیاں ہوں، ساتھ ہی ایک خطیر رقم بینک بیلنس کے طور پر بھی ہو، تاکہ چہار طرف سے لوگ اس کی مدح و ستائش میں رطب اللسان نظر آئیں اور اس طرح اس کا شمار اصحاب ثروت میں ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں ایک چوب خشک سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں اور نہ ہی ان چیزوں میں جن کو وہ نعمت خداوندی سمجھتا ہے اتنی جان ہے کہ وہ انسانی مشکلات سے بچاؤ کا سامان بن سکیں، یا مشکل وقت میں مصائب و تکالیف سے نجات دے سکیں، مگر وہ ان کی خاطر دیوانہ وار اپنا خون پسینہ ایک کیے رہتا ہے اور مال و دولت کے حصول میں اپنی جان کو کھپا دیتا ہے، جب کہ اس سب کا فائدہ کسی دوسرے ہی کو حاصل ہونا یقینی ہے۔

ہماری زندگی کا سفینہ مادیت کے جس گرداب میں پھنسا ہے اس کو ”زندگی“ نہیں کہتے، یہ زندگی تو بس معدہ اور نفس کی غلام ہے، جو محض نفع اندوزی، خود غرضی اور مفادات سے عبارت ہے، اس زندگی کا احساسات و

دنیا کے معرکہ کارزار میں انسانوں کا ایک بڑا طبقہ جمود کا شکار اور مشینی زندگی گزارنے کا عادی ہے، جو صبح کو اٹھتا ہے اور ناشتہ کرتا ہے، پھر اپنے کام پر لگ جاتا ہے، پڑھنے والا اپنے مدرسہ یا اسکول چلا جاتا ہے، بزنس مین اپنا بزنس سنبھالنے کی فکر میں لگ جاتا ہے، ملازم پیشہ اپنے آفس کا رخ کرتا ہے، کسان اپنے کھیت میں مشغول ہو جاتا ہے، مزدور اپنے کام میں مست ہو جاتا ہے، ڈاکٹر اپنے کلینک پر بیٹھ جاتا ہے اور کاری گر کارخانہ کے کاموں میں جٹ جاتا ہے، غرض جس کا جو پیشہ اور کام ہے وہ اس میں مصروف عمل ہو جاتا ہے، پھر وہ دوپہر کے وقت اپنے گھر واپس آتا ہے اور تنہا یا بسا اوقات اپنے اہل خانہ کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتا ہے اور دوبارہ اپنے کام میں لگن ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ جب سورج ڈھل جاتا ہے تو آدمی اپنے گھر واپس آتا ہے اور لمبی تان کر سو جاتا ہے، تاکہ دن بھر کی ٹینشن ختم ہو سکے، طبیعت کو سکون مل جائے، مکان کا اثر اور کاموں کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور آئندہ کل پورے جوش و جذبہ سے دوبارہ کام پر لگ جائے، تاکہ وہ از سر نو اپنی محنت کا پھل اس طرح حاصل کر سکے کہ اس کے پاس پہننے کے لیے بیش قیمت پوشاکیں ہوں،

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے

مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

بسانحطاط المسلمین“ میں دکھایا ہے کہ مسلمانوں کے زوال سے دنیا نے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں، اور اب وہ تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے، کوئی اگر اس کو سنبھال سکتا ہے تو وہ امت مسلمہ ہے۔

آج اس امت کے نوجوانوں کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ حقائق پر غور کریں، اپنی زندگی کو بدلنے کی کوشش کریں، اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں، اور دنیا کو وہ آب حیات پیش کریں جو ان کے پاس ایک امانت ہے، دنیا کی یہ ضرورت اگر پوری نہ کی گئی تو وہ مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے کمر بستہ ہے، وہ حیات ابدی کی نعمتوں سے محروم ہے اور اس دنیا کا سکون بھی اس کو حاصل نہیں، یہ سکون اس کو جہاں سے مل سکتا تھا وہ راستے ہم مسلمانوں نے بند کر رکھے ہیں، اور اپنی زندگی اس سے ہٹا لی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کی ایک بہت بھیا تک تصویر لوگوں کے سامنے ہے اور دنیا آب حیات کو زہر ہلاہل کا پیالہ سمجھ رہی ہے، مسلمانوں کی عزت کا راستہ یہی ہے کہ وہ خود بھی اس آب حیات سے فائدہ اٹھائیں، جو ان کو ان کے نبی سے حاصل ہوا ہے اور دنیا کو بھی سکون و ایمان کا وہ تحفہ پیش کریں جو دنیا و آخرت کی نجات کا تہا راستہ ہے۔

اگر مسلمانوں نے اور خاص طور پر نوجوانوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تو وہ دن دور نہیں کہ حالات کچھ اور ہوں گے اور دنیا کے نقشہ میں مسلمان ہوں گے۔

☆☆☆☆☆

بڑی بڑی چٹانیں تو وہ خاک ہو کر رہ گئیں، ان کا جذبہ ایمانی اور جہد مسلسل نے دنیا کی حالت بدل ڈالی، وہ رہبان باللیل و فرسان بالنہار کا مصداق تھے، راتوں کو اللہ کے سامنے رونے والے اور دن میں مسلسل محنت کرنے والے، دنیا کی کوئی طاقت ان کے سامنے ٹک نہ سکی، اور آج حالت ہے کہ مسلمان کا سہ گدائی لیے کھڑے ہیں، کوئی اس میں روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دے، مسلمانوں کو اللہ نے لوگوں کا سہارا بنایا تھا، ان کو دینے کے لیے پیدا کیا گیا تھا، ان کے پاس جو نظام زندگی تھا مردہ دلوں کے لیے آب حیات تھا، نوجوان خود اس سے محروم ہیں، یہ حالت یکساں نظر آتی ہے، حد یہ ہے کہ دین دار حلقوں میں، مدارس کی چہار دیواری میں بھی ایک مایوسی کی فضا نظر آتی ہے:

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ معرفت، نہ محبت، نہ زندگی، نہ نگاہ
شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے نوجوانوں کو
جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے:

کبھی اے نوجوان مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا تھا ایک ٹوٹا ہوا تارہ
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی
ندویؒ نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں ان
نوجوانوں سے اپیل کی ہے اور اپنی معرکہ
الآراء کتاب ”ماذا خسر العالم

یورپ و امریکہ اور اسرائیل ایک مثلث ہیں، جس کا سب سے بڑا مقصد مسلمانوں کو کمزور کرنا اور اسلام سے ان کے رشتہ کو ختم کرنا ہے، جس کے لیے وہ ہر طرح کے وسائل استعمال کر رہے ہیں، بات کوئی نئی نہیں ہے، صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد سے فکری حملوں کی یلغار ہے اور مسلمان غیر شعوری طور پر اس کا شکار ہو رہے ہیں، اور خاص طور پر مسلمان نوجوانوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے، ان کی توانائیاں برباد کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، تاکہ وہ کسی قابل نہ رہیں، اور اس طرح امت اسلامیہ کا مستقبل تاریک ہوتا چلا جائے، انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ اپنے عمل میں پرجوش ہیں اور ان کی مسلسل بحث جاری ہے اور ہم ہر طرح کی تہی دامن کی باوجود غفلت کا شکار ہیں، مسلمان نوجوانوں کی رگوں میں لگتا ہے خون خشک ہو گیا ہے، ان کو ذرا بھی اس سازش کا احساس نہیں وہ اپنی رنگ رلیوں میں ایسے مست ہیں کہ ان کو ذرا بھی خیال نہیں کہ ان کی گاڑی کس ڈھلوان پر پڑ گئی ہے، اور آگے کس چٹان سے ٹکرانے والی ہے۔

دین جب آیا تھا تو کسمپرسی کے حال میں تھا، لیکن نئے خون نے اس میں ایک ایسی توانائی پیدا کر دی کہ دنیا میں بڑی بڑی طاقتوں کو جھکن پڑا، وہ حضرات صحابہ تھے جن کے ایمان کے آگے

ارشاد و تذکیر

رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان اور اس کے تقاضے

مولانا سراج الدین ندوی

دے اس کو مانا جائے، جس بات سے رو کے اس سے رکا جائے۔ ارشاد در بانی ہے: ”رسول تمہیں جو کچھ دے اسے لے لو اور جس سے رو کے اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، بے شک وہ سخت سزا دینے والا ہے“۔ [الحشر: ۷] اگر ہم زبان سے یہ دعویٰ کریں کہ حضرت محمد اللہ کے سچے رسول ہیں مگر آپ کی ہدایات پر عمل نہ کریں تو پھر ہمارا دعویٰ جھوٹا ثابت ہوگا۔ جب ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ کے رسول جو کچھ کہتے ہیں اللہ کی طرف سے کہہ رہے ہیں تو پھر آپ کی اطاعت نہ کرنا دراصل خدا کی اطاعت نہ کرنا ہے۔ پیغمبر کی جانب سے ہم تک کسی بات کا پہنچنا اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ بات برحق ہے۔ چاہے ہماری سمجھ میں اس کی حکمت آئے یا نہ آئے۔ جب ہم ایک شخص کو اچھا ڈاکٹر مان لیتے ہیں اور اس پر بھروسہ کر کے اس سے علاج کراتے ہیں تو اب ڈاکٹر کی حیثیت سے اس کی ہر بات پر عمل کرنا ضروری ہے ورنہ پھر ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مثلاً ہماری آنکھ میں درد ہے، ڈاکٹر ہمارے ہاتھ میں آنکھنشن لگانا چاہتا ہے، اگر ہم یہ کہہ کر آنکھنشن لگوانے سے انکار کر دیں کہ درد تو ہماری آنکھ میں ہے اور تم آنکھنشن ہاتھ میں لگا رہے ہو یہ سنتے ہی ڈاکٹر ہمیں ڈانٹ کر بھگا دے گا۔ جب ہم نے اسے اچھا ڈاکٹر تسلیم کر لیا تو اب بلا چون و چرا اس کی بات ماننا چاہیے اور اس کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے اور ہم ایسا کرتے بھی ہیں، ایک معمولی ڈاکٹر کے کہنے سے ہم دوا کا استعمال کرتے ہیں، پرہیز کرتے ہیں، اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر دوا غلط طریقہ پر کھائی، یا نہیں کھائی یا پرہیز نہیں کیا تو نقصان ہوگا۔ تو نبی،

انسانوں سے الگ صفات کے حامل ہیں وہ کیسے انسانوں کی رہنمائی کر سکتے ہیں؟ صرف اور صرف تیسرا طریقہ ہی معقول تھا۔

اللہ نے اس کام کے لیے ایسے انسان منتخب کیے جو خود بھی بڑی صلاحیت رکھتے تھے اور اللہ نے انہیں اپنا خصوصی علم عطا کیا تاکہ وہ بندوں کو زندگی گزارنے کا صحیح صحیح طریقہ بتا سکیں اور اپنے عمل سے اس راستہ پر چل کر دکھاسکیں۔ یہی اللہ کے فرستادہ بندے تھے، جنہیں ہم رسول یا نبی کہتے ہیں۔ ان کی سیرت، ان کے عادات و اطوار اتنے بلند اور پاکیزہ ہوتے ہیں کہ دیکھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی سچائی و راست روی، شرافت و سادگی، دیانت و ایمان داری، محبت و خیر خواہی، عفت و پاکدامنی، حقوق کی ادائیگی اور کردار کی بلندی اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ ان کے قول و عمل میں بے مثال یکسانیت ہوتی ہے۔ ہر شخص انہیں دیکھ کر پکار اٹھتا ہے یہ عام انسان نہیں ہیں، یہ تو خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں۔ اللہ کے یہ نبی ہر دور میں آتے رہے۔ آخر میں حضرت محمد شریف لائے۔ اب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ آپ آخری نبی ہیں اور آپ پر نازل کیا گیا قرآن قیامت تک کے لیے ہدایت نامہ ہے۔

رسول پر ایمان لانے کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ رسول جس بات کا حکم

اسلام کی اصطلاح میں رسول اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچائے، خدائی ہدایات کی روشنی میں انسانوں کی رہنمائی کرے۔ اللہ پر ایمان لانے اور اسے خالق تسلیم کر لینے کا تقاضا ہے کہ ہم یہ بھی تسلیم کریں کہ اللہ نے صرف پیدا کر کے یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ ہمیں زندگی گزارنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عام استعمال کی چیزوں خاص طور پر الیکٹرانک اشیاء کے ساتھ ایک گانڈ بک بھی دستیاب ہوتی ہے تو پھر بے شمار صلاحیتوں کے حامل انسان کو بغیر کسی رہنمائی کے کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔ قرآن میں کہا گیا: ”ہمارا مالک وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کی ہدایت کا سامان کیا“۔ [سورہ طہ]

انسانوں کو ہدایت دینے کے مختلف طریقے ہو سکتے تھے۔ اللہ ہر انسان کو الگ الگ ہدایت نامہ دے کر بھیجتا۔ اللہ کسی فرشتے کو اپنا پیغمبر بنا تا وہ فرشتہ ہر انسان کی رہنمائی کرتا یا اللہ کسی ایک انسان کو اس کے لیے منتخب کرتا۔ پہلے طریقے کی غیر معقولیت واضح ہے۔ ہر انسان کو ہر وقت رہنمائی کرنا عقل کے خلاف ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک استاذ بھی اپنے طالب علموں کو ایک ساتھ درس دیتا ہے۔ حکومت بھی اپنے نمائندے کے ذریعہ اپنے احکامات نافذ کرتی ہے۔ رہا دوسرا طریقہ تو اس میں یہ اعتراض ہوتا کہ فرشتے

رسول اور پیغمبر جیسی عظیم ہستی کے تعلق سے ہمارا رویہ اس سے بھی زیادہ اطاعت گزاری کا ہونا چاہیے۔ جب ہم نے حضرت محمدؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کر لیا تو اب آپ کی ہر بات بلا چون و چرا ماننا ہمارے لیے ضروری ہو گیا۔ ورنہ ہم سیدھے راستہ سے بھٹک جائیں گے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ”جس نے میری فرماں برداری کی اس نے اللہ کی فرماں برداری کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔“ [مسلم]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اے رسول! آپ فرمادیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو (اس کے نتیجہ میں) اللہ تم سے محبت کرے گا۔“ [آل عمران: ۳۱]

کوئی شخص آنحضرتؐ پر ایمان لانے کا دعویٰ بھی کرے اور زندگی گزارنے کے لیے ان کے طریقہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات کا بندہ ہے۔ وہ آپؐ کی اطاعت کر کے بظاہر دنیا کی لذتوں اور مادی فائدوں کو نہیں چھوڑنا چاہتا، یا پھر اس نے اپنے اوپر شیطان کو اتنا حاوی کر لیا ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے ٹکنبہ سے نکلنا اس کے لیے دشوار ہے یا پھر وہ رسم و رواج اور آباء و اجداد کی اندھی پیروی میں گرفتار ہے اور اس کے ذہن و دماغ پر عصبیت کی گہری تہیں جمی ہوئی ہیں۔ ان سب صورتوں میں ایمان کامل کا دعویٰ کرنا ایک فضول بات ہے۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ”تم میں سے کوئی شخص اس وقت مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشات میری لائی ہوئی ہدایات کے تابع نہ ہو جائیں۔“

[الجامع الصغیر]

اب جب کہ آپؐ بنفس نفیس موجود نہیں ہیں مگر آپؐ کی سنت، آپؐ کا اسوہ، آپؐ کی سیرت اور آپؐ کی احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ ایک مومن کے لیے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت ہی اصل اساس اور بنیاد ہیں۔ اہل ایمان کو ہر معاملہ میں ان دونوں بنیادوں کو اصل حیثیت دینی چاہیے۔ اگر کوئی شخص ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر زندگی کے معاملات اللہ اور رسول کی ہدایت کے مطابق انجام نہیں دیتا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ حقیقت میں وہ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا ہے۔ حقیقت ہے کہ دینی امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے نہ کچھ کہتے تھے نہ کرتے تھے بلکہ آپؐ جو کچھ ارشاد فرماتے یا کوئی دینی عمل کرتے وہ اللہ کے حکم اور اس کی اجازت سے کرتے۔ چنانچہ قرآن پاک میں آپؐ کے بارے میں فرمایا گیا: ”وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے، وہ جو بھی کہتے ہیں وحی ہوتی ہے جو آپؐ کو کی جاتی ہے۔“ اللہ کے رسول کی اطاعت کا مطلب اللہ کی اطاعت اور رسول کی نافرمانی کا مطلب اللہ کی نافرمانی ہے:

”جس نے رسول کی اطاعت کی تو حقیقت

میں اس نے اللہ کی اطاعت کی۔“ [النساء: ۸۰]

نبی اکرمؐ پر ایمان کا تقاضا ہے کہ ہم آپؐ سے محبت کریں، آپؐ سے محبت ایک مومن کے لیے ایمان کا حصہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ”تم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک تم مجھ سے اپنی اولاد اور اپنے ماں باپ اور تمام انسانوں سے زیادہ محبت نہ کرنے لگو۔“ [بخاری، مسلم]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا تقاضا

ہے کہ آپؐ پر زیادہ سے زیادہ درود و سلام بھیجا

جائے۔ قرآن مجید میں اہل ایمان کو اس کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا: ”بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ پس اے ایمان والو! تم بھی نبی پر درود و سلام بھیجو۔“ [الاحزاب: ۵۶]

جب بھی آپؐ کا اسم گرامی سنئے یا بولیں تو نام کے ساتھ ”صلی اللہ علیہ وسلم“ ضرور کہیے۔ بعض اہل تقویٰ تو آپؐ کا نام بے وضو نہیں لیتے تھے۔ ہر نماز کے بعد آپؐ پر درود بھیجتے، جمعہ کے دن خاص طور پر درود پڑھنے کا اہتمام کیجئے۔ درود پڑھنے کی احادیث میں بہت تاکید کی گئی اور بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ آپؐ نے درود پڑھنے اور بھیجنے والے کی شفاعت کا وعدہ فرمایا ہے۔ درود و سلام کے بہت سے الفاظ خود نبی کریمؐ نے امت کو سکھائے ہیں۔ ان کو یاد کیجئے اور اٹھتے بیٹھتے آپؐ پر درود بھیجئے۔ احادیث میں اس شخص کو بخیل اور نامراد کہا گیا ہے جو آپؐ کا نام سن کر آپؐ پر درود نہ بھیجے۔

آپؐ پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم آپؐ کی لائی ہوئی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچائیں۔ کیوں کہ آپؐ نے آخری حج کے موقع پر حاضرین کو یہ حکم دیا تھا کہ: ”جو لوگ حاضر ہیں وہ ان لوگوں تک جو غیر حاضر ہیں یہ باتیں پہنچادیں۔“ اسی طرح ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا: ”خواہ ایک ہی آیت تمہیں معلوم ہو اسے دوسروں کو پہنچادو۔“ [مسلم]، یاد رکھنا چاہیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا تقاضا محبت ہے، محبت کا تقاضا اطاعت ہے اور محبت و اطاعت کا تقاضا ہے کہ آپؐ کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچایا جائے اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کو غالب کیا جائے۔

☆☆☆☆☆

میر کاروان

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان.....

انیس احمد ندوی

طرح صدام حسین کو دنیا نے ایک ہیرو کی حیثیت سے تسلیم کیا مگر حضرت مولانا اور ساری ندوی برادری نے اسکے بعضی (بعث پارٹی) والے نظریات کی شد و مد سے مخالفت کی۔

ایہرجنسی کے زمانہ میں ملک کا تحفظ

ہندوستان میں ایہرجنسی کا نفاذ اس کی جمہوریت پر کلنک کا ایک ٹیکہ تھا، جمہوریت داغدار ہی نہیں شرمسار بھی ہوئی، لاکھوں لوگ بے گھر کر دیے گئے، ہزاروں ہزار لوگ جیلوں میں ڈال دیے گئے، میڈم ڈکٹیٹر نے پورے ملک میں خوف و ہراس کا ماحول پیدا کر دیا تھا، نس بندی جبراً کی جا رہی تھی، کئی علماء نے اسکی تائید بھی کر دی تھی، حضرت مولانا پر اس کا گہرا اثر تھا، مولانا اس کی روک تھام کے لیے اور ملک میں پھیلنے والی انارکی کو ختم کرنے کے لیے فکر مند تھے، اسی دوران انھیں موقع ملا اور انھوں نے پرائم منسٹر سے بڑے واضح انداز میں بات کی، ملک کی آزادی میں کانگریس کا کردار انکے پتا ملک کے پہلے وزیر اعظم آنجنمانی جواہر لال کی قربانیوں کو یاد دلایا نیز ملک میں چھائی ہوئی سراپیسنگی، خوف و ہراس اور مایوسی کی نہایت موثر تصویر کشی کی، جس کا اندرا گاندھی پر مثبت اثر ہوا، ایسے پرخطر ماحول میں سچ بات کہنا اور حق کی ترجمانی کرنا آسان کام نہیں تھا، حضرت مولانا کے موقف اور اسکے برملا اظہار سے گرمی احرار کا اندازہ ہوتا ہے، وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان.....

ہندو احياء پرستی کا مقابلہ
ملک میں ہندو احياء پرستی کے عفریت نے سر اٹھایا تو اس کی سرکوبی کے لیے بھی حضرت نے

دل لے کر اس دنیائے رنگ و بو میں آئے تھے، قوم و ملت کی اجتماعیت، اتحاد و سالمیت ان کی متاع عزیز تھی، وہ ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا میں سرمایہ ملت کے نگہبان تھے، اللہ نے انھیں قوم و ملت کی سربلندی کے لیے دعوت فکر و عمل کی خصوصیت سے نوازا تھا، وہ بیسویں صدی کے ایسے عظیم مفکر تھے جنھوں نے دنیا کو ایک نیا رخ دینے کی بھرپور کوشش کی، ان کے سامنے اسلامی برادری کا عالمی تصور و نمونہ تھا وہ اسلام میں رنگ و نسل کی برتری کے قائل نہیں تھے۔

آپ کا شباب ہے ۱۹۶۵-۱۹۶۷ء کا زمانہ ہے، فکر عالمگیر ہے قوم و ملت کی سربلندی دامنگیر ہے، اسکی دستگیری عزیز ہے، مصر میں جمال عبد الناصر کا طوطی بول رہا ہے، اس نے قومیت عربیہ کا نعرہ بلند کیا جس میں نسل پرستی کی بو کے ساتھ ساتھ اسلام جو حدود و ثغور کی بندشوں سے آزاد ہے اسکی حد بندی کا اعلان بھی، حضرت مولانا نے خاندانی روایتوں کو توڑ کر پوری قوت کے ساتھ اسکی پرزور مخالفت کی، اس نے کئی عرب ممالک کو اپنا ہم نوا بنا لیا تھا اسکا جادو پورے عرب میں سر چڑھ کر بول رہا تھا لیکن عرب اسرائیل جنگ صرف چھ دن میں اسرائیل کی بالادستی کے ساتھ ختم ہوئی، وقت نے یہ ثابت کیا کہ وہ ایک ہیرو نہیں بلکہ مہلک قوم و ملت تھا، اس کا قومیت عربیہ کو لاکرنا اسلام میں نسل پرستی کو دعوت دینا تھا، اسی

حضرت مولانا علی میاں ندوی کا نام آتے ہی ایک عہد ساز شخصیت کا چہرہ سامنے آتا ہے، ایک مدبر، ایک مفکر، ایک مجدد، ایک مورخ، نبض شناس قوم و ملت، دیدہ ور، گفتار و کردار کا غازی نیز مصلح قوم مسلم کا چہرہ سامنے آتا ہے، ایسی عہد ساز شخصیتیں عہد دراز کے بعد ریل مسکوں میں وجود پذیر ہوتی ہیں چشم نرگس کی برسہا برس اشکباری پر چمن میں کوئی ایسا دیدہ ور اشہب زبان و قلم نیز شناور اصلاح و تجدید پیدا ہوتا ہے جو حقیقت میں بندہ مومن کی تصویر کامل ہوتا ہے، وہ زمینی املاک اور قوت و حشمت نہ رکھتے ہوئے بھی دلوں پر حکومت کرتا ہے پوری دنیا سے بے نیاز ہونے کے باوجود بندہ مولا صفات ہوتا ہے، علی میاں کی یہ خصوصیت عوام و خواص میں آفتاب کے مانند جگ ظاہر تھی، اللہ تعالیٰ نے انہیں عوام و خواص میں یکساں مقبولیت عطا فرمائی تھی جس کا انھوں نے استعمال قوم و ملت کی صلاح و فلاح نیز اس کی سربلندی کے لیے فرمایا، یوں تو حضرت کی پوری زندگی قوم و ملت کے لیے وقف تھی لیکن تجدید و اصلاح قوم مسلم نیز ان کی فلاح و ترقی کے لیے جو نمایاں کام حضرت نے انجام دیے ان میں سے کچھ کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عرب قومیت کے فتنہ کی سرکوبی

حضرت مولانا علی میاں ندوی ایک حساس

پورے شد و مد کے ساتھ کوشش کی، اس حقیقت سے لوگ واقف ہو گئے کہ ویشو ہندو پریشد نے ۷-۱۸ اپریل ۱۹۸۴ء کو ایک خفیہ اجلاس منعقد کیا جس میں ملک بھر کے ہندو انتہا پسند شریک ہوئے، اس میں مسلمانوں کی نسل کشی کے ساتھ ساتھ بنارس کی گیان واپی مسجد، مٹھرا کی عید گاہ اور ایودھیا کی باہری مسجد کو آزاد کرانے کے پہلی کو ویشو ناتھ کا مندر، دوسری کو کرشن جنم بھومی اور باہری مسجد کو رام جنم بھومی میں تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا تھا، وہ مسلمانوں کو ایک جماعت کی حیثیت سے باقی نہیں رہنے دینا چاہتے تھے، حضرت مولانا کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے کہ انھوں نے جنونی حد تک بڑھتی ہوئی ہندو احمیائیت پسندی جو ملک کو ایک طوفان کی طرح برباد کر رہی تھی اور دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی، پر قدغن لگائے جانے کی بھرپور کوشش کی، ایسے پرخطر نیز سنگین ماحول میں حضرت نے آنجہانی پرائم منسٹر مندر اندرا گاندھی کو ایک اہم خط لکھا، جس میں انھوں نے ملک کی بقا، استحکام نیز اتحاد و ترقی کے لیے ویشو ہندو پریشد کو ملک کے لیے سنگین خطرہ قرار دیا اور بہر صورتاً آزادی کے رہنماؤں بشمول جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی ابوالکلام آزاد وغیرہ کے اصولوں پر کار بند رہنے، صحیح جمہوریت، سچی سیکولرزم، ہندو مسلم اتحاد اور عدم تشدد کے اصولوں کو اپنانے کی تلقین کی، اسی کے ساتھ آپ نے انھیں اخلاقی انارکی اور کرپشن کی ہولناکی کی طرف بھی متوجہ کیا، مولانا نے انھیں حقیقی سیکولرزم، صحیح جمہوریت اور ہندو مسلم اتحاد نیز عدم تشدد کے راستہ کو اپنانے کی تلقین کی، جس کا پرائم منسٹر نے مثبت نوٹس لیا۔

مسلمانوں کے عائلی نظام کا تحفظ

مسلمان ہندوستان میں کئی محاذ پر حالات سے نبرد آزما تھے، یہاں پر مسلمانوں کا اپنا شرعی و ملی تشخص، عائلی نظام کے ساتھ جینا مشکل ہوتا جا رہا تھا، ہندو انتہا پسند تنظیموں کی طرف سے بار بار یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی بات کی جا رہی تھی، شاہ بانو کیس میں مسلم مطلقہ کو نان و نفقہ دیے جانے کا کورٹ نے فیصلہ سنا دیا تھا، فسادات کا ایسا بھیانک سلسلہ قائم تھا جو تھکنے کا نام نہیں لے رہا تھا، مسلمانوں کی جان مال عزت و آبرو سب خطرہ میں تھی، انکی تہذیب و ثقافت پر قدغن لگائی جا رہی تھی غرضیکہ مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کی سازش پر عمل ہو رہا تھا، ایسے تیرہ و تار، افسوسناک اور دلگیر صورتحال میں حضرت مولانا نے کلیدی کردار ادا کرتے ہوئے راجیو گاندھی کو خط لکھا اور ملاقات بھی کی، آپ کی اور پرسنل لاء بورڈ کی کوششوں کے نتیجے میں مسلم مطلقہ بل پارلیمنٹ سے منظور ہوا اور جو ایک زبردست ہنگامہ اور مسلمانوں میں ابال تھا، فرو ہوا، اسی طرح مولانا نے فسادات کی روک تھام کے لیے اپنی سطح سے اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کے پلیٹ فارم سے پوری کوشش کی۔

پیام انسانیت فورم کا قیام

حضرت مولانا کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو حروف زریں سے لکھے جانے کے قابل ہے، ملک میں حالات بگڑتے جا رہے تھے، ہندو احمیائیت اور انتہا پسندی کا جنون بڑھتا جا رہا تھا، جمہوریت اور سیکولرزم کے اصولوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی، عدم رواداری، کرپشن، اور تشدد کی ذہنیت پروان چڑھ

رہی تھی، ملک انارکی کی کھڈ کی طرف جیزی سے بڑھ رہا تھا، ایسے میں حضرت مولانا گویا کہ پیام انسانیت فورم نہیں بلکہ ملک و ملت بچاؤ تحریک شروع کی، اس تحریک میں صرف ملت کا تحفظ نہیں تھا بلکہ ملک کی سالمیت، اسکا اتحاد اور یہاں ہزاروں برس سے ایک ساتھ رہے ہندو مسلم کے درمیان رواداری کی دیرینہ روایتوں کا تحفظ تھا، جو لوگ اس تحریک کو صرف ہندوؤں کو مسلمانوں سے قریب کرنے والی ایک تحریک مانتے ہیں یقیناً وہ حضرت مولانا کی اس تحریک کے وسیع و آفاقی کیونوں کے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہیں، مولانا نے خود اس امر کی وضاحت کی ہے، ”کاروان زندگی“ حصہ دوم صفحہ ۱۱۰ پر مولانا لکھتے ہیں:

”یہ بالکل فطری اور قدرتی امر ہے کہ آدمی اپنے اس گھر کی بربادی نہیں دیکھ سکتا جس میں اسکو رہنا ہے اور جہاں اسکی عزیز متاع اور زندگی کی پونجی ہے اور جس کے بنانے اور سنوارنے پر اسکی اور اسکے اسلاف کی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں صرف ہوئی ہیں، یہ ہر سلیم الفطرت بلکہ صحیح الفطرت انسان کا خاصہ ہے کہ جس کشتی پر وہ سوار ہے اس میں وہ کسی کو سوراخ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا، دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس شاخ پر اس کا نشیمن ہے عقل و ہوش کی موجودگی میں نہ اس پر خود تیشہ چلا سکتا ہے اور نہ کسی کو تیشہ چلانے کی اجازت دے سکتا ہے۔“

آگے صفحہ ۱۱۳ پر لکھتے ہیں: ”اس بناء پر میں اس بات کے سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ اخلاقی سدھار کی مہم اور پیام انسانیت کی تحریک ملک کے تمام دینی تعلیمی علمی کوششوں اور تحریکوں کے لیے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے جس کے

پیروانِ اسلام کے لیے عملی نمونہ

مولانا ابوالکلام آزادؒ

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم اسلام کی جس حقیقت کو دنیا کے آگے پیش کرنا چاہتا تھا، اس کے لحاظ سے اگر کوئی زندگی ”اسوۂ حسنہ“ ہو سکتی تھی تو وہ صرف حضرت ابراہیمؑ کی زندگی تھی، اسلام ایک صداقت ہے اور اس لیے دنیا میں اس وقت سے موجود ہے، جس وقت سے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں صداقت ہے؛ لیکن اس صداقت میں کو ایک شریعت الہیہ کی صورت میں سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے پیش کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ہر جگہ ان کو ملتِ حنیفی کے اولین واعظ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتلائی ہے کہ: ”اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ اَسْلِمْنَا قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ“ (جب حضرت ابراہیمؑ سے ان کے پروردگار نے کہا کہ (سچے فرمانبردار) ہو جاؤ، تو انہوں نے کہا کہ میں اسلام لایا تمام جہانوں کے پروردگار کے لیے)۔

چوں کہ حضرت ابراہیمؑ اسلام کے پہلے داعی تھے، اس لیے ان کا وجود بیکسر پیکر اسلام تھا اور اپنے عمل حیات کے اندر اسلام کی حقیقت کا ایک عملی نمونہ رکھتے تھے، وہ اسلام کے واعظ تھے اور واعظ کے لیے اولین شے یہ تھی کہ تعلیم کے ساتھ خود اپنی زندگی کا عملی نمونہ بھی پیش کر دے اور جن حقیقتوں کی طرف دنیا کو دعوت دیتا ہے ان کو سب سے پہلے اپنے اوپر طاری کر دے، حضرت ابراہیمؑ نے ان حقائق کو اپنے اوپر طاری کیا، اس لیے کہ ان کا ہر عمل صدائے اسلام تھا اور وہی پیروانِ اسلام کے لیے عملی نمونہ یا ”اسوۂ حسنہ“ ہو سکتا تھا اور یہی سبب ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ان کی زندگی کے تمام اعمال ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیے اور ان کے ذکر کو بقائے دوام عطا فرمایا، دنیا کے بڑے بڑے کشورستانوں، عظیم الشان ذاتوں اور خشکیوں اور سمندروں پر حکمرانی کرنے والی قوموں کو ہم آثارِ قدیمہ کے کھنڈروں، بوسیدہ قبروں، قومی روایتوں اور تاریخ کے کہنہ اوراق میں ضرور دیکھ سکتے ہیں، مگر تمام مجمع اولین و آخرین میں ایک انسانی ہستی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے اعمال حیاتِ صفحوں اور مٹی کے ڈھیروں میں نہیں، بلکہ کروڑوں انسانوں کے اعمال کے اندر سے اپنی حیات کا ثبوت دے سکتے ہوں، ہر سال ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو دنیا کے سامنے ”اسوۂ ابراہیمی“ کی لازوال زندگی کا یہی عجیب منظر ہوتا ہے جب کہ تاریخ کئی ہزار برس آگے بڑھ کر لوٹتی ہے تاکہ اسلام کے داعی اول کی زندگی کو ایک بار پھر دہرا دے، لاکھوں انسانوں کا مجمع ہوتا ہے، جس میں ہر وجود پیکر ابراہیمؑ بن جاتا ہے اور ”مقامِ خلعت“ کی سلطنت تعین اور تشخص کو فنا کر کے اس پورے مجمع کو ایک ”ابراہیم خلیل“ کی صورت میں نمایاں کر دیتی ہے: ”وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا“ (اور ہم نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کو اپنی رحمت میں سے بڑا حصہ دیا اور ان کے لیے اعلیٰ و اشرف (طریق) ذکر خیر دنیا میں باقی رکھا)۔

☆☆☆

اندر رہ کر ہر کوشش کامیاب ہو سکتی ہے اور اس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے پرسکون اور معتدل فضا مہیا ہوگی۔“

آگے مزید لکھتے ہیں: ”بس ہم سب اسی کشتی کے سوار ہیں، یہ ہمارے ملک کی کشتی ہے اگر خدا نخواستہ ڈوبی تو نہ ہمارے ادارے بچیں گے نہ کتب خانے نہ مقدس اور خدا رسیدہ افراد نہ عالم و فاضل نہ بزرگ، میرے نزدیک مسلمانوں کو من حیث الجماعۃ اس کا کچھ بھی فائدہ نہ پہونچے اور ملک کو فائدہ پہونچ جائے جب بھی انکو یہ کام کرنا چاہیے وہ اپنے دین و منصب کے لحاظ سے اس کے لیے مامور ہیں اور ملک کے ہر فائدہ میں شریک لیکن میرے نزدیک مسلمانوں کے لیے اس ملک میں باعزت طریقہ پر رہنے کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنی افادیت ثابت کریں اور اخلاقی قیادت کے اس خلا کو پر کریں جو عرصہ دراز سے اس ملک میں چلا آ رہا ہے۔“

اسی طرح مولانا کے تجدیدی کارناموں میں مجلس تحقیقات و شریات اسلام کا قیام ہے جو اردو، عربی، انگریزی اور ہندی میں کتابوں کے چھاپنے اور پھیلانے کا ایک اہم پلیٹ فارم ہے، اسی طرح مسلم مجلس مشاورت میں آپ کی سرگرمیاں مسلمانوں کے ملی تشخص کی بقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں، مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرونے اور ملی تشخص کے وجود و بقا کے لیے ان کی کڑھن، درد مندی و فکر مندی نیز اصلاح و دعوت کا انوکھا انداز بھی انکا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی درجات بلند فرمائے۔

☆☆☆☆☆

مغرب اور اسلام

اسلاموفوبیا اور مغربی دنیا

عید الرحمن ندوی

اندازہ ہو جاتا ہے۔

Runnymede Trust کی

رپورٹ میں اسلاموفوبیا کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

ایک نظریہ یا عالمی رائے جو بے بنیاد خوف اور نفرت پر مبنی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ امتیاز اور بے گانگی برتی جاتی ہے۔

(Encyclopedia of Race and Ethics P-215)

امریکی مصنف Stephen

Schwartz نے اسلاموفوبیا کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

اسلام کی ہر چیز کی مذمت کرنا، اس کی تاریخ کو پر تشدد قرار دینا، مسلمانوں میں اعتماد پسند اکثریت کی نفی کرنا، اسلام کو پوری دنیا کے لئے مسئلہ بنا کر پیش کرنا، مسلمان دنیا میں جہاں بھی معرکہ آراء ہیں، اس بارے میں ان ہی کو تصور وار سمجھنا، مسلمانوں کو ان کے مذہب میں تبدیلی لانے پر اصرار کرنا اور ان کے خلاف محاذ جنگ شروع کرنا۔

(Front page Magazine -April 2005)

Wikipedia میں اسلاموفوبیا کی

تعریف اس طرح درج ہے:

اسلاموفوبیا سے مراد اسلام، مسلمان اور

آج اسلاموفوبیا ایک زہر کی طرح پورے سماج میں گھلتا جا رہا ہے، اور اس کا جنون ٹوپی، داڑھی، حجاب، مساجد، مینارے اور مقابر تک محدود نہیں بلکہ پورے اسلامی ثقافت اور تہذیب بھی اس کی زد میں ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ عام طور پر مغرب میں ان واقعات کو دہشت گردی کہا جاتا ہے جن میں مجرم مسلمان ہوتا ہے لیکن اگر ایسے واقعات کا مرتکب کوئی غیر مسلم ہوتا ہے تو اس کے جرم کو نفرت یا ذہنی مرض کہہ دیا جاتا ہے، اور ایسے حادثات کو میڈیا بھی نمایاں نہیں کرتا ہے، اگر انصاف کی عینک سے دیکھا جائے تو دنیا کے دیگر ممالک میں بھی یہی رجحان غالب ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ صرف اسلام کو بدنام کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس کو دنیا کے نقشے سے ہٹانے کے لیے بین الاقوامی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اسلاموفوبیا کی اصطلاح ایجاد کی گئی ہے، فوبیا ایک لاطینی لفظ ہے اس کے لغوی معنی خوف اور ڈر کے ہیں۔ جیسے Hydrophobia پانی سے ڈر، Acrophobia اونچائی سے ڈر، Ailurophobia بلیوں سے ڈر، Phobaphobia کسی حادثہ سے ڈر، Aviophobia اڑنے سے ڈر، Claustrophobia بلند جگہوں سے ڈر وغیرہ، اسلاموفوبیا کی مندرجہ ذیل تعریفات سے دشمنان اسلام کی اصل منشا و مقصد سے بخوبی

اسلامی ثقافت سے نفرت کا اظہار، اس کی تشریح اس کی طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ ایک ایسا نظریہ جو یہ سمجھتا ہے کہ تمام یا اکثر مسلمانوں میں مذہبی تشدد ہوتا ہے، وہ غیر مسلموں کے بارے میں جارحانہ نقطہ نظر رکھتے ہیں، مساوات، رواداری اور جمہوریت کے تصور کو مسلمان یہ سمجھ کر رد کر دیتے ہیں کہ یہ سب ان کے مذہب کی تعلیمات کے خلاف ہیں۔

[اقلیتوں کے حقوق اور اسلاموفوبیا: ص/

۴۲۷-۴۲۸]

آج اسلاموفوبیا کو فروغ دینے میں میڈیا کا سب سے زیادہ اہم رول رہا ہے، اور ان کی جانب سے اہم رول کیوں نہ ہو، 95% مغربی میڈیا اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ اور منفی خبروں کو شائع کرنے میں مصروف عمل ہیں اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مغربی میڈیا پر یہودیوں کی بالادستی اور پورا قبضہ ہے۔ امریکہ کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار ”واشنگٹن پوسٹ“، ”نیویارک ٹائمز“، اور ”وال اسٹریٹ جرنل“ بھی یہودیوں کے اخبارات ہیں جو امریکی سیاست اور اقتصادیت پر غیر معمولی کنٹرول رکھتے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کے بکھراؤ اور دنیا میں ایک قطبی نظام کے قائم ہونے کے بعد (جس کی سرپرستی امریکہ کر رہا ہے) کوئی عالمی نظام کے لیے خطرے کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا ہے اور آخر میں ۹/۱۱ حادثہ اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والے واقعات نے اسلاموفوبیا کو جن کی انداز میں فروغ دینے میں کلیدی رول ادا کیا ہے جو ہنوز جاری و ساری ہے۔

قابل ذکر امر یہ ہے کہ ”عالمی قوت کی حیثیت سے سوویت یونین کے منتشر ہونے کے بعد امریکہ نے جس نئے عالمی نظام کا خاکہ تیار کیا ہے اس کے چار اہم ستون ہیں، ان چاروں کا اصل مقصد یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں جب تک ممکن ہو امریکہ کو واحد سپر پاور کی حیثیت حاصل رہے اور کوئی متبادل قوت وجود میں نہ رہے۔

یہ چار ستون جن پر امریکی عمارت تعمیر ہوگی اس طرح ہیں:

۱- عالمگیریت (Globalization) جس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں ایک ایسا معاشی نظام قائم کیا جائے جس میں آزاد تجارت، سرمایہ کی آزاد حرکت اور کثیر المقاصد بین الاقوامی کمپنیوں کے ذریعہ عالمی معیشت پر مغربی اقوام اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ کے تسلط کو دائمی شکل دی جائے۔

۲- اس نظام کا دوسرا ستون سیاسی ہے، یعنی انفرادی آزادی، جمہوریت، حقوق انسانی کا تحفظ اور مذہبی رواداری کی ترویج، اور اس کے پردے میں ان ممالک میں ایسے نظاموں کا قیام عمل میں لایا جائے جن کو سیاسی جوڑ توڑ، مالی وسائل، معاشی مراعات اور ذرائع معلومات کے توسط سے فکری کنٹرول اور تہذیبی غلبے کے ذریعہ بہ آسانی متاثر کیا جاسکتا ہے۔

۳- اس نظام کا تیسرا ستون ٹکنالوجی ہے، خصوصیت سے نیوکلیئر اور ہائی ٹیک (HI-TECH) کمپیوٹر ٹکنالوجی پر مغربی اقوام کی اجارہ داری ہے، نئے دفاعی نظام کا بنیادی ستون امریکہ کی مستقل اور ناقابل چیلنج عسکری قوت کا استحکام اور اسے جہاں سے بھی کوئی خطرہ

ہوا (خواہ وہ کتنا ہی موہوم کیوں نہ ہو) اسے ختم کرنے کا ہے۔

۴- اس نظام کا چوتھا ستون نئی سیاسی حصار بندی ہے جسے بہت ہی ہوشیاری لیکن عیاری کے ساتھ انجام دیا جا رہا ہے، اس میں ناٹو کی توسیع، مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کی عسکری بالادستی کے قیام کے بعد اس کے معاشی غلبے کے لئے عربوں کے ساتھ صلح کے معاہدہ کی کوشش، وسط ایشیا میں ایک بار پھر روس اور مغرب سے منسلک ریاستوں کے مسلمان ریاستوں پر اثر انداز ہونے اور ہندوستان کو ایک ایشیائی قوت کے طور سے آگے لانے کی کوشش تاکہ اسلامی ممالک اور وہاں سرگرم عمل اسلامی تحریکوں پر قابو پانے کا منصوبہ پورا کیا جائے۔ مغربی میڈیا کے ذریعہ مندرجہ بالا چاروں ستونوں کو مستحکم بنانے میں امریکہ اور اس کی حلیف طاقتیں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر رہی ہیں۔ [مغربی میڈیا اور اس کے اثرات، صفحہ ۱۸-۱۹]

”مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسینی ندوی“ اپنی تحریروں اور مجلسوں میں برابر فرمایا کرتے تھے کہ امریکی (عیسائی) وسائل اور یہودی دماغ دونوں ہی اسلام کو جڑ سے اکھاڑنے میں پوری قوت سے لگ گئے ہیں۔ ایک طرف فوجی طاقت کے ذریعہ مسلمانوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے تو دوسری طرف عالمگیریت (Globalization) کے نام سے اعتقادی اور تہذیبی ارتداد کے سانچے میں انہیں ڈھالنے کی سر توڑ کوشش کی جا رہی ہے۔“

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مغرب اسلاموفوبیا کو آلہ کار بنا کر اور گلوبلائزیشن کی حکمت عملی اختیار کر کے دین اسلام کو صفحہ ہستی

سے مٹا سکتا ہے۔ جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ بھلا ذرا سوچئے جو دین اللہ کا پسندیدہ ہوا اور جس کے بارے میں ارشاد خداوندی یوں ہو ”یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (یعنی دین اسلام) کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں، حالانکہ اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا، گو کافر کیسے ہی ناخوش ہوں، (چنانچہ) وہ اللہ ایسا ہے جس نے (اس اتمام نور کے لیے) اپنے رسول (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین (یعنی اسلام) دے کر بھیجا ہے تاکہ اس (دین) کو تمام (بقیہ) دینوں پر غالب کر دے (کہ یہی اتمام ہے) گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔“

[الصف: ۸-۹]

آخر میں راقم اپنی بات معروف اسکالر ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی ایک فکرائیگیز اقتباس پر ختم کرتا ہے: ”کوئی اگر ہم سے پوچھے کہ اسلام کا سب سے بڑا معجزہ کیا ہے؟ یا دوسرے الفاظ میں اسلام کی حقانیت کی سب سے بڑی دلیل کیا ہے؟ تو میں پوری دیانت و بصیرت کے ساتھ ہوش و حواس کی سلامتی اور خدا کے سامنے جوابدہی کے احساس کے ساتھ اور ہر طرح کے دلائل و براہین، علمی و تاریخی حقائق کے چیلنجوں کی حقیقت سمجھتے ہوئے عرض کروں گا کہ اسلام کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ اسلام آج بھی زندہ اور باقی ہے، دنیا بھر میں اس کی جو دشمنی اور مخالفت کی گئی ہے اگر اس کا نصف یا چوتھائی بلکہ دس درجہ کم بھی مخالفت بھی کسی مذہب کی کی گئی ہوتی تو وہ مذہب تاریخ کے ملبوں کے نیچے دب کر فنا ہو چکا ہوتا۔“

☆☆☆☆☆

رسید کتب

تعارف و تبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

نام کتاب: جواہر پارے

مرتب: سیف اللہ ندوی

مولانا سید عبد اللہ محمد حسنی رحمۃ اللہ علیہ خانوادہ حسنی رائے بریلی کی ایک ممتاز و نمایاں شخصیت تھے، مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی قدس سرہ و ناظم ندوۃ العلماء و صدر مسلم پرسنل لا بورڈ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم و سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جیسی علمی، فکری اور روحانی شخصیات نے آپ کی علمی، فکری اور روحانی شخصیت کی پرورش اور نشوونما میں بنیادی طور پر حصہ لیا، اور ان مبارک ہستیوں کے فیض سے اسلامی تشخص کے یہ تینوں عناصر آپ میں بھرپور پائے جاتے تھے۔

مولانا سید عبد اللہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ ایک کامیاب معلم و مدرس، داعی الی اللہ اور ارشاد و تربیت کے میدان کے شہسوار تھے۔ زبان کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلم میں بھی بڑی تاثیر رکھی تھی، دعوت میں حکمت و فراست سے نوازا تھا، اور اصلاح و تربیت کے میدان میں بھی حق تعالیٰ نے آپ کو خوب کامیابی عطا کی تھی، اور مردم سازی آپ کی جملہ صفات میں ایک نمایاں وصف تھا، جو ہر معلم و مفکر اور مصلح کو عطا نہیں ہوتا۔

مجموعی اعتبار سے مولانا علیہ الرحمہ کی شخصیت ایک ایسی شخصیت تھی، جو امت کی فکر کرنے والی

اور گمراہ انسانیت کو راہ راست پر لانے کا جذبہ رکھنے والی تھی۔ آپ کی تقریریں، تحریریں اور مجلسیں اسی فکر و جذبہ کا مظہر ہوا کرتیں، اور آپ یہی فکر و جذبہ اپنے ہم نشینوں میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے۔ حق تعالیٰ نے گرچہ آپ کو عمر زیادہ طویل نہیں دی، لیکن آپ نے اپنی عمر مستعار کا اک و قیع حصہ جدوجہد اور کدوکاوش میں صرف کیا، اور بہت سے افراد تیار کیے اور ان کے اندر روح عمل چھوڑی۔

”جواہر پارے“ جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مجلسی افادات پر مشتمل ہے، سیف اللہ ندوی صاحب استاد مدرسۃ الفلاح اندور کا ایک مفید کام ہے، جس کو پڑھ کر نہ صرف یہ کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یاد تازہ ہوتی ہے؛ بلکہ اس کا ایک ایک جملہ اور ایک ایک لفظ غمگینی کے لیے ہوتے ہیں، جس کی تپش قاری اپنے دل پر محسوس کر سکتا ہے، اور گویا:

از دل خیزد بر دل ریزد
کا مصداق ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اسلوب کلام کی دو اہم اور موثر خصوصیات تھیں؛ اول یہ کہ آپ بڑے نکتہ سنج تھے، اور کتاب و سنت سے ایسے معانی اور مفہم اخذ کرتے تھے کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو گہری نظر عنایت فرمائی تھی؛ عام زندگی کے احوال اور جدید وسائل کے حوالہ سے ایسی مثالیں اور نظائر پیش

کرتے کہ حاضرین کو نصیحت و عبرت کے ساتھ لطف و حظ بھی حاصل ہوتا۔

”جواہر پارے“ میں قاری کو یہ نکتہ سنجی اور دقت نظر بھی ملے گی، مولانا کی علمی، فکری اور روحانی شخصیت کا ایک عکس جمیل بھی نظر آئے گا، اور اہل تعلق کی تسلی کا سامان بھی۔

اللہ تعالیٰ اس کاوش کو مشکور و مقبول فرمائے، اور مفید و نافع بنائے۔

نام کتاب: المیسر فی علم أصول الفقہ مرتب: محبوب بن یونس پالن پوری

علم اصول فقہ علوم اسلامیہ کی تعلیم دینے والے اداروں کے نصاب کا اہم حصہ ہے، اس فن میں برصغیر کے مدارس اسلامیہ میں ”اصول الشاشی“ نہایت مقبول کتاب ہے جو پڑھائی جاتی ہے۔ اس کتاب کی خوبی کے لیے یہ کافی ہے تقریباً ہزار سال سے یہ مختلف تعلیمی اداروں کے نصاب میں اپنی جگہ اور اہمیت بنائے ہوئے، اور اس کا کوئی ایسا بدل نہیں پیش کیا جاسکا جو برصغیر کے اہل مدارس کے ذوق پر پورا اتر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصول فقہ کی صلاحیت اور اس فن میں مہارت پیدا کرنے کے لیے یہ ایک بنیادی اور زیادہ مباحث کو شامل کتاب ہے۔

درس نظامی کی دیگر بہت سی کتب کی طرح یہ کتاب بھی ابھی تک قدیم طرز طباعت کا ایک نمونہ تھی، جس میں رموز اوقاف کی رعایت کی جاتی ہے، نہ پیرا گراف الگ الگ رکھے جاتے ہیں، اور نہ ہی عناوین وضع کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے، اس پر طرہ یہ کہ ہاتھ کی کتابت جس میں غلطیاں بھی بکثرت اور تصویر در تصویر طباعت کی وجہ سے واضح اور صاف بھی نہیں۔ طلبہ کیا اساتذہ تک کو مطالعہ میں بڑی دشواری اور کوفت کا سامنا

سید احمد شہید اکیڈمی کی جدید و دیدہ زیب مطبوعات

حق و باطل کی کشمکش - سورہ کہف کی روشنی میں

از: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

سورہ کہف کی جامع تفسیر، قرآن سے شغف اور عربی زبان و ادب کے خاص ذوق کی غماز!
الفاظ و معانی کی دلکش پیرایہ میں تشریح و تطبیق، خواص و عوام دونوں کے لیے یکساں مفید!
صفحات: ۲۲۲ قیمت: ۲۰۰

ایشیا کیا ہے؟

از: مولانا سید بلال عبداللحی حسنی ندوی

حدیث کی شہرہ آفاق کتاب ”تہذیب الاخلاق“ کے ”باب الإیشار والمؤاساة“ کا درس!
خود غرضی و مادیت کے دور میں ایشیا و قربانی کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے ایک مؤثر رسالہ!
طلبہ و علماء اور عوام سب کے لیے ایک بہترین تحفہ!
صفحات: ۵۶ قیمت: ۳۰

حلال کمائی اور اس کے ذرائع

از: مفتی راشد حسین ندوی

موجودہ حالات کے تناظر میں حلال کمائی اور اس کے ذرائع پر سیر حاصل بحث!
جدید مسائل پر فقہی بصیرت کے ساتھ معتدلانہ کلام اور شرعی نقطہ نظر کی وضاحت!
طلبہ اور فقہی ذوق رکھنے والوں کے لیے ایک بہترین سوغات!
صفحات: ۱۵۲ قیمت: ۱۰۰

رابطہ: سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات، میدان پور، تکیہ کلاں، رائے بریلی (موبائل 9919331295)

نوٹ: یہ کتابیں لکھنؤ کے سبھی مکتبوں میں دستیاب ہیں۔

کرنا پڑتا تھا۔ اب الحمد للہ ایک تحریک چل پڑی ہے، نصاب کی تشکیل و کی طرح نصاب کی کتابوں کی طباعت پر بھی توجہ کی جا رہی ہے؛ اور جدید انداز میں ان کی طباعت کا اہتمام کیا جا رہا ہے؛ گرچہ ابھی بھی عربی کتب کا وہ ذوق طباعت ہند و پاک میں نظر نہیں آتا جو بلا د عرب میں ہے، پھر بھی اس طرز طباعت سے درس و مطالعہ میں بہت سہولت پیدا ہوگئی ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہمارے سامنے

”المیسر فی علم أصول الفقہ فی ضوء اصول الشاشی بأسلوب جدید“ ہے، جس کی پہلی اشاعت ایک سال قبل ہوگئی تھی، تاہم اس میں کچھ اصلاحات کی گنجائش تھی اور کچھ طباعت کی غلطیاں بھی۔ پہلی طباعت کی مقبولیت کے بعد ماشاء اللہ اب دوسری طباعت تصحیح و تنقیح کے بعد اہل علم کے لیے دستیاب ہے۔

ملاحظہ رہے کہ ”المیسر“ کے جامع و مرتب مولانا محبوب پالن پوری (دارالعلوم نذیریہ کاوسی، پٹن، گجرات) نے نہ صرف رموز و اوقاف، پیرا گراف، ذیلی عناوین وغیرہ کا اہتمام کیا ہے؛ بلکہ کتاب ”اصول الشاشی“ کے فہم و تفہیم کو مزید آسان بنانے کے لیے اس کے مباحث کو بھی نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مباحث میں اضافہ کیا ہے، اور نئے دور کی مثالوں کو بھی پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ خود مستقل ایک تصنیف بن گئی ہے جو ہوسکتا ہے کہ اصل کتاب کی جگہ مستقبل میں لے لے۔

لکھنؤ، سہارنپور، دیوبند، احمد آباد اور بمبئی

کے دینی کتب خانوں پر دستیاب ہے۔

رابطہ کے لیے: ۹۳۷۵۳۳۳۳۳۳۳

☆☆☆☆☆

عہد اسلامی میں علم ریاضی میں پیش رفت

شاہد عمادی (لکھنؤ)

پیدا ہوا) نے دنیا کو اس نئے علم سے روشناس کرایا۔ اس کے بنائے نقشے (Trigonometry Tables) آج بھی صحیح پائے گئے۔ محمد ابن الباتی نے جیومیٹری میں اقلیدس کی شرحیں لکھیں اور مظفر الاسفراری نے اقلیدس کی ۱۴ کتابوں کا خلاصہ لکھا، جبکہ فخر الدین رازی نے مفید بحث تصنیف کی۔ تیرہویں صدی کا نصیر الدین طوسی اور محی الدین الغری جیومیٹری میں کمال علم رکھتے تھے۔

عہد مامونی کا نامور سائنس دان محمد بن موسیٰ خوارزمی (۲۳۲ھ ۸۵۰ء) دنیا کا اولین ریاضی داں تھا، جس کی تصنیف ”جبر و مقابلہ“ نے دنیا کو الجبرا کے علم سے روشناس کرایا۔ علاوہ ازیں اصطرلاب، دھوپ گھڑی اور ٹرگنومیٹری پر کتابیں تصنیف کیں۔ مولینا شبلی نعمانی لکھتے ہیں: ”علم جبر و مقابلہ پر اسلام میں جو پہلی کتاب لکھی گئی وہ اسی عہد کے ایک مشہور عالم محمد بن موسیٰ خوارزمی نے مامون کی فرمائش پر لکھی تھی۔ یہ تصنیف آج بھی موجود ہے اور اس قدر جامع و مرتب ہے کہ علماء نے بعد میں سیکڑوں کتابیں تصنیف کیں لیکن اصل مسائل میں اس سے زیادہ ترقی نہ کر سکے۔“ علم ریاضی کی یہ کتاب چودھویں صدی میں جب یورپ پہنچی تو دانشوران یورپ اس کتاب پر حیرت زدہ ہوئے۔ لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ اسی وقت ہوا، انگریزی ترجمہ روزن Rozen نے لندن سے ۱۸۳۱ء میں پہلی بار طبع کیا۔ نامور سائنس دان ابوالعباس فضل بن نیریری علم موسمیات، ہیئت، اور ریاضی میں کمال کی دسترس رکھتا تھا۔ علم ہیئت پر اسکی مشہور تصنیف چار جلدوں میں ہے۔ اس نے زاویوں کے ظل Tangents کی قیمتیں دریافت کیں۔ ابو محمد

مرعوب کر دیا تھا۔ انہوں نے چنانچہ بغداد، قرطبہ اور غرناطہ کی طرز پر یورپ میں بھی تعلیم گاہیں قائم کیں اور عربی کتابوں کے ترجمہ دو تین صدی تک ان کی یونیورسٹیوں میں رائج رہے۔ اہل یورپ میں ان وقتوں میں ہندسے سے رائج تھے، جبکہ عربوں کے عربی ہندسوں کو انہوں نے بہت آسان پایا اور قبول کیا جو علم حساب میں بہت سود مند تھا۔

عربی ہندسہ	۱۶۰	رومن ہندسہ
۱۶۰	CLX	
۳۸	XXXVIII	

حجاج بن یوسف مطر ۲۱۴ھ علم ہندسہ (Geometry) میں ماہر تھا، اور اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ اس نے دو بڑے کام کئے، مقدمات اقلیدس کے نام سے ایک جامع کتاب علم ریاضی میں مرتب کی دوسرا کام قدیم وقتوں کی مشہور کتاب الجسطی کو اصلاح ثانی کے بعد مرتب کی۔ جیومیٹری میں اسے بہت دلچسپی تھی، اور نئے نئے انکشافات کئے، جو آج بھی رائج ہیں۔ جیومیٹری کی کتاب ”مقدمات اقلیدس“ کا ترجمہ یورپ میں ڈنمارک میں ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ حجاج کی کتابیں بیسویں صدی تک یورپ اور دنیا کے تعلیمی اداروں میں رائج تھیں۔ علم المثلثات (Trigonometry) کا انکشاف کر کے ابواسحاق ابراہیم بن یحییٰ نقاش الزرقانی (Arzachel)، (قرطبہ، اسپین میں ۱۰۲۹ء میں

قرن اول کے مسلمانوں میں شروع سے ہی علوم و فنون میں دلچسپی کا رجحان پیدا ہو چلا تھا۔ سائنس کی مختلف شاخوں یعنی علم ہیئت (Astronomy)، علم ریاضی (Mathematics)، طب (Medicine)، کیمیا (chemistry)، جراحی (Surgery)، نباتات (Botany)، علم حیوانات (Zoology) وغیرہ میں جو بے پناہ پیش رفت عہد وسطیٰ میں ہوئی اس کی مثال تاریخ میں پھر کبھی نہ ملی۔ گراں قدر علمی کارنامے انجام پائے اور انکشافات و نئی نئی ایجادات رقم ہوئیں۔ علم ریاضی کی مختلف شاخوں میں علم الحساب (Arithmetics)، الجبراء (Geometry)، الجبراء (Algebra)، ٹرگنومیٹری (Trigonometry) تجارتی حساب (Commerce)، وغیرہ میں پیش رفت ہوئی، اور قابل قدر تصنیفات نے اہل علم کو بہت فائدہ پہنچایا۔ بغداد، قرطبہ اور غرناطہ کی عظیم الشان یونیورسٹیاں اس عہد میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں، جہاں یورپ کے طلباء بھی داخلہ لیتے اور اپنے ساتھ عربوں سے حاصل علم کی سوغات واپس لے جاتے۔ بعد کو جب یورپ میں بیداری آئی تو مسلمانوں کی خوشحالی، ہر سوتہذیبی و تمدنی ترقی، دولت کی ریل پیل اور بری و بحری فوجی طاقت و تعلیمی و طبی انتظامات نے انہیں

عدلی قائن نے Mensuration پر عہد وسطیٰ کی اولین کتاب تصنیف کی۔

عراق کا شہر حران، سکندر اعظم کے دور میں ایک نوآبادی تھی۔ حران کا باشندہ ثابت بن قرہ (۹۰۱ء) علم طب، ہدیت اور ریاضی میں اعلیٰ دستگاہ رکھتا تھا۔ جیومیٹری میں ان کے کلیے اور مسئلہ عہد نو کے لئے سنگ میل ثابت ہوئے۔ حران کا باشندہ ابو عبید اللہ محمد بن جابر البنانی (۳۰۵ھ، ۹۲۹ء) جو علم فلکیات کے علاوہ علم ریاضی میں بھی مشہور تھا۔ علم مثلث (Trigonometry) میں اس کی دریافتیں اہل علم کے لئے سنگ میل تھیں۔ زاویوں کے جیب (Trigonometrical es) اور ظل التمام (Cotangents) اور ظل التمام (Cotangents) کے نقشے سب سے پہلے تیار کئے اور ان کو رواج دیا۔ جابر البنانی کا شمار دنیا کے تین بڑے ریاضی دانوں میں ہوتا ہے۔

ابو کمال شجاع بن اسلم بن محمد الحاسب مصری (۹۵۵ء) کی مایہ ناز تصنیف ”الجبرا“ دنیا کی اہم ترین کتاب ہے، جس میں (Quadratic Equations) اور (Radicals) پر تحقیقات درج ہیں۔ سترہویں صدی کا مشہور مغربی ریاضی داں لیونارڈو (Leonardo) نے شجاع کے الجبرے کی تعریف کی ہے۔ ترکستان کے نامور جغرافیہ داں اور ماہر ریاضی داں احمد بن سہل بلخی ۹۳۴ء کی تصنیفات اور اٹلس صور الاقلم سے مدتوں اہل یورپ مستفید ہوتے رہے۔

ابوالقاسم مسلمہ بن مجریطی اندلس کا ممتاز سائنسداں تھا جسے علم ریاضی میں خاص دلچسپی تھی۔ میڈرڈ شہر میں پیدا ہوا، اور علم کی قدر و منزلت

کرنے والے تین بادشاہوں کا دور دیکھا، عبدالرحمن الناصر (۹۱۶ھ)، حکم ثانی (۹۷۶ھ)، اور ہشام ثانی (۱۰۰۹ھ)۔ ابوالقاسم کو تجارتی حساب (Commercial Arithmetic) میں دلچسپی تھی۔ اس نے تجارتی حساب کے بنیادی اصول و طریقے بیان کئے۔ ان وقتوں تجارت اور کاروبار پر مسلمانوں کا غلبہ تھا، اور بحیرہ روم پر عربوں کے بحری بیڑے قابض تھے۔ یورپ کی عظیم منڈی غرناطہ ایک انتہائی خوشحال خوبصورت اور دولت مند آبادی تھی، جہاں علم ریاضی اور ہدیت اور اصطرلاب سازی میں کمال علم رکھنے والا عظیم دانشور ابوالقاسم اصباح (پیدائش ۹۷۹ء) کی تجارتی حساب (commerce) پر تصنیف نے مدتوں اہل مغرب سے داد و تحسین حاصل کی۔ علم ریاضی پر اس کی ایک اور تصنیف اعداد کی خاصیتوں پر مشہور تھی۔ علم ہدیت پر اس کے انکشافات اور مشاہدات نے اہل علم کو متاثر کیا۔ اور ہدیت کی جدیدیں سدھانت کے ہندی طریقہ کے مطابق ترتیب دیا۔

امام زمانہ ابو مسلم عمر بن احمد بن خلدون (التونی ۲۴۹ھ) جس کی مشہور تاریخ اور مقدمہ آج بھی اہل علم میں بہت معروف ہے، اشبیلہ (اندلس) میں پیدا ہوا، اور جیومیٹری میں ماہر تھا۔ اسپین کا ہی امام فن اور مشہور زمانہ فلسفی ابن باجہ (OMBUS) ۵۳۵ھ جیومیٹری میں کامل دستگاہ رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں کئی نامور ریاضی داں اندلس کی سرزمین سے ابھرے جن کی تصنیفات نے علم ریاضی کی مختلف شاخوں میں نئے نئے انکشافات و مشاہدات درج کئے، جس کی روشنی میں علم و حکمت کو بے پناہ ترقی ہوئی۔

سلجوقی دور کا عظیم مفکر، شاعر اور سائنسداں ابو فتح عمر بن ابراہیم خیام (۱۰۳۹ء تا ۱۱۳۱ء) علم ہدیت و ریاضی میں ماہر تھا۔ الجبرا میں Binomial Theorem اس کا اہم انکشاف ہے۔ خیام کی کتاب ”الجبر والمقابلہ“ کے بارے میں مولینا شبلی لکھتے ہیں: ”اس نادر کتاب نے اہل یورپ کے نزدیک عمر خیام کو ریاضی داں اعظم ہونے کا ثبوت دیا“، سبھی سال کی مقدار ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۹ منٹ عمر خیام کی دریافت ہے جو آج کی دریافت سے صرف ۱۱۶۳ سکند کا فرق رکھتی ہے۔ اس کی تیار کردہ تقویم، ایک عظیم کارنامہ ہے۔ لیپ سال عمر خیام نے رائج کیا، اور آج جو عیسوی کیلنڈر دنیا میں رائج ہے یہی اس کا بنیاد ہوا ہے۔

مولانا شبلی رقمطراز ہیں: ”عہد وسطیٰ میں مسلمانوں کا قدم نہ آتا تو یونان، مصر، ہند، اور فارس کے علمی ذخیرے آج برباد ہو چکے ہوتے۔“ بقول ایم جی گوڈ ”عہد وسطیٰ میں مسلمان دنیا کی سب سے متمدن اور مہذب قوم تھی۔ انہوں نے مشرق و مغرب کو بیدار کر کے انہیں علوم کا انمول خزانہ دیا۔“ ۱۱۳۰ء میں طلیطلہ (اسپین) میں مدرسہ مترجمین قائم کیا گیا، اور معروف عربی تصانیف کے لاطینی زبان میں ترجمے کئے گئے، جس نے اہل یورپ کو انقلاب کے راستہ پر لاکھڑا کیا۔

ماخذ:

- ۱- مسلمان سائنسداں، از مولانا ابراہیم عمادی ندوی
- ۲- علوم قدیمہ و مسلمان، از علامہ شبلی نعمانی
- ۳- قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات، از مولوی محمد عبدالرحمن خان۔

☆☆☆☆☆

فقہ و فتاویٰ

سوال و جواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی

زیادہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ زیادتی عقد میں مشروط نہ ہو بلکہ اتفاقاً قرض ادا کرتے وقت کچھ زیادہ دیدیا جائے؟

جواب: قرض ادا کرتے وقت کچھ زیادہ دیدیا جائے جبکہ زیادتی عقد میں مشروط ہو اور نہ اس کا رواج ہو کہ زیادتی کی امید کی جاتی ہو، تو ایسی صورت میں قرض سے زیادہ دینا درست ہے۔

[جامع ترمذی: ج ۱/ص ۲۴۰]

سوال: آج کل لوگوں میں بلا ضرورت قرض لینے کا کافی رواج ہو گیا ہے، کیا بغیر مجبوری بھی قرض لینا جائز ہے؟

جواب: احادیث نبویؐ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مقروض بننا کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے اور جب تک کوئی واقعی حاجت درپیش نہ ہوتی الا مکان اس سے بچنا چاہیے، بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقروض بننے سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔

[صحیح بخاری: ۲۳۹۷]

سوال: قرض لینے کے بعد اسکی ادائیگی کی فکر نہ کرنا یا ادا کرنے کی پوزیشن ہو اس کے باوجود ٹال مٹول سے کام لینا شرعاً کیسا ہے؟

جواب: ضرورت کے وقت ادائیگی کی نیت سے قرض لینا جائز ہے، لیکن قرض لے کر اس سے غافل ہو جانا اور ادائیگی کی نیت نہ کرنا جائز نہیں، حدیث نبویؐ میں ہے کہ غفلت کے تین درجے ہیں: ان میں سے ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی قرض کی ادائیگی سے اس طرح غافل ہو جائے کہ وہ اس پر سوار ہوتا چلا جائے، اور اس کا خوف اس پر مسلط ہو جائے۔

[شرح مشکل الآثار للطحاوی: ۴۲۸]

دوسری حدیث میں ہے کہ: مالدار شخص کا قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ [ترمذی]

☆☆☆☆☆

لانا جائز نہیں، اگر سود کی رقم کسی مسلمان کے پاس آجائے تو اسے چاہیے کہ بلا نیت صدقہ و ثواب غریب پر خرچ کر دے۔

[بذل الجہود: ج ۱/ص ۳۷]

سوال: بکرنے زید سے قرض لیا لیکن تقریباً ۱۰۰ سال سے زید کا علم نہیں اور بکر قرض ادا کرنا چاہتا ہے تو کس طرح ادا کرے، کیا ان کے ورثاء کو قرض ادا کرنے سے ادائیگی ہو جائے گی؟

جواب: اگر بکر نے زید سے قرض لیا ہو اور زید کا علم نہ ہو اور نہ اس کے ملنے کی امید ہو، البتہ ان کے ورثاء کا پتہ ہو تو اس صورت میں زید سے لیا گیا قرض ان کے ورثاء کو دیا جائے گا، اس طرح قرض کی ادائیگی ہو جائے گی۔

[رد المحتار علی الدر المختار: ج ۶/ص ۴۳۳]

سوال: ایک شخص کے دادا نے قرض لیا تھا لیکن ادائیگی سے پہلے ان کی وفات ہوئی اور انہوں نے کسی وارث کو قرض ادا کرنے کی وصیت نہیں کی، اب ان کے ورثاء ان کی جانب سے قرض ادا کرنا چاہتے ہیں، تو کیا قرض کی ادائیگی ہو جائے گی؟

جواب: اگر کسی نے قرض لیا ہو اور قرض ادا کرنے سے پہلے ان کی وفات ہو جائے تو ان کے ترکہ سے قرض کی ادائیگی کی جائے اور اگر میت نے قرض کی ادائیگی کی وصیت نہیں کی اور ورثاء ادا کر دیں تو یہ بھی کافی ہو جائے گا۔

[درمختار: ج ۲/ص ۵۳۳]

سوال: قرض کی ادائیگی کے وقت قرض سے

سوال: کیا بینک سے حاصل شدہ سودی رقم، بحالت مجبوری کسی کورسوت میں دی جاسکتی ہے، اگر رشوت نہ دی جائے تو کام ہونا مشکل ہو جائے اور نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے، اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: رشوت دینا خود حرام ہے اور رشوت کے ساتھ اس میں سود کی رقم دینا دہرا گناہ ہے، اس لیے یہ صورت جائز نہیں ہے، ہاں اگر کوئی نا حق ظلم سے بچنے کے لیے رشوت دینے پر مجبور ہو جائے تو اس صورت میں اس کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی مقامی دارالافتاء کے مفتی کے سامنے سارے احوال رکھ کر ان سے رائے لی جائے وہ جو رائے دیں اس پر عمل کیا جائے۔

سوال: سودی رقم یتیم لڑکی کی شادی میں دے کر یا پیار شخص کی مدد کر کے ثواب حاصل کیا جاسکتا ہے؟

جواب: سودی رقم ثواب کی نیت سے دینا گناہ ہے کیونکہ مال حرام سے صدقہ کرنا صدقہ کی توہین ہے، البتہ بلا نیت صدقہ یتیم لڑکی کی شادی یا پیار شخص کے علاج کے لیے سودی رقم دی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ اس کے محتاج ہوں اور شادی اور علاج کے لیے ان کے پاس جائز رقم موجود نہ ہو۔

[رد المحتار: ج ۷/ص ۲۲۳]

سوال: کیا حاصل شدہ سودی رقم کسی ضرورت مند یا غریب کو بطور قرض حسنہ دے کر واپس شدہ رقم اپنے مصرف میں لاسکتے ہیں؟

جواب: سودی رقم قرض میں دینا، پھر قرض سے واپسی کے بعد اسے اپنے مصرف میں

NADWATUL-ULAMA

PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)



ندوة العلماء

پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یو پی (ہند)

باسمہ تعالیٰ

Date 10th January 2023

تاریخ ۱۰ جنوری ۲۰۲۳ء

اپیل برائے تعمیر اسٹاف کوارٹرز

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ ناظم ندوۃ العلماء کی سرپرستی میں اپنی علمی و دینی خدمت میں مصروف ہے، دارالعلوم اور اس کی شاخوں میں علمی و تعلیمی امور حسب معمول جاری ہیں، اساتذہ و کارکنان ندوۃ العلماء اپنی ذمہ داریوں کو انجام دے رہے ہیں۔ اساتذہ و اسٹاف کی کثرت کی وجہ سے دارالعلوم میں ان کی رہائش کی مزید گنجائش نہیں رہی تو احاطہ دارالعلوم کے علاوہ معہد دارالعلوم ندوۃ العلماء (سکروری) میں اسٹاف کوارٹرز اور معہد سے قریب مستقل طور پر ندوہ کالونی کی سہ منزلہ عمارت تعمیر ہوئی، مگر اب بھی اسٹاف کے لیے کوارٹرز کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی، اس صورت حال کے پیش نظر پہلے ندوہ کیمپس سے متصل محلہ مکارم نگر میں اسٹاف کوارٹرز تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو الحمد للہ اہل خیر کے تعاون سے مکمل ہو گیا۔ اب کیمپس کے اندر ہی مزید کوارٹرز کی تعمیر اللہ تعالیٰ کی مدد کے بھروسہ پر شروع کرادی گئی ہے، زیر تعمیر یہ عمارت تین منزلہ ہوگی، جس میں ۹ فیملی کوارٹرز ہوں گے، اس کی تعمیر پر مبلغ -/1,15,00,000 (ایک کروڑ پندرہ لاکھ روپے) کے خرچ کا تخمینہ ہے جو ان شاء اللہ اہل خیر حضرات کے تعاون سے پورا ہوگا۔

ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اس اہم ضرورت کی طرف فوری توجہ فرمائیں گے اور ندوۃ العلماء کے کارکنوں کا ہاتھ بٹائیں گے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسہ ہے کہ اس کی مدد سے یہ اہم کام تکمیل کو پہنچے گا، وما ذلک علی اللہ بجزیز۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی (مولانا ڈاکٹر) سعید الحسن اعظمی ندوی (ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی (مولانا) سید بلال عبدالحی حسنی ندوی
معمتد تعلیم ندوۃ العلماء معتمد مال ندوۃ العلماء مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء ناظر عام ندوۃ العلماء

نوٹ: چیک/ڈرافٹ صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتے پر ارسال کریں

NIZAMAT NADWATUL ULAMA

Nizammat Office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marg, Lucknow - 226007 (U.P.)

مطہیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91 - 8736833376

پر مطلع فرمانے زحمت کریں، اس سے دفتری کارروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

NADWATUL ULAMA

STATE BANK OF INDIA MAIN BRANCH, LUCKNOW
(IFSC CODE : SBIN0000125)

تعمیرات

A/c. No. 1086 3759 733

ONLINE DONATION LINK

<https://www.nadwa.in/donation/>

website : www.nadwa.in
Email : nizammat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا